گاندھی

(اہنسا کا سپاہی)

پی، ڈی ٹنڈن
روینڈائی ولزلے

مترجم

محمد حسن قدوائی

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

GANDHI AHINSA KA SIPAHI

By : P. D. TANDON AND ROLLAND E. WELSLEY

Translated by ; Mohd. HASAN KIDWAI

سنہ اشاعت : جنوری تا مارچ 1984 شک 1905

پہلا اڈیشن : 1000

قیمت : 12-50

سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 310
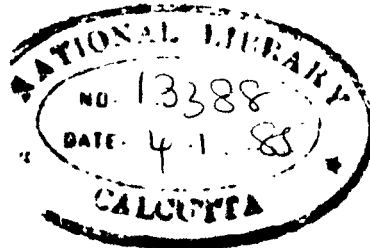
اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومتِ ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع : سپر پرنٹرس دہلی ۵۱

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقا کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقا کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا ہے جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کر چکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اُردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائرکٹر ترقی اُردو بیورو

دیباچہ

دنیا کے مختلف حصّوں میں جب ایک کے بعد دوسرا بحران آتا ہے تو لوگ پوچھنے لگتے ہیں کہ کیا انسان کے پاس اپنے مسائل کے حل کرنے کے لیے تشدد کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے وہ یہ معلوم کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ کیا جنگ کے قانونی تشدد اور جنگ کے علاوہ قتل اور مار پیٹ کے غیر قانونی تشدد سے ہمارا پیچھا کبھی چھٹنے والا نہیں ؟

چاہے وہ باہمی جنگ کے روائتی ہتھیار ہوں یا ہزاروں میل دور سے پھینکے جانے والے میزائل ہتھیار ہوں۔ انسان کو تباہ کرنے کے ذرائع کی خطرناکی برابر بڑھتی جارہی ہے اس لیے انسانی سماج زندگی کے تمام تجربوں کی مدد سے ایک جواب اور اگر ممکن ہو تو نئے جواب کی تلاش میں ہے۔

موہن داس کرمچند گاندھی کا خیال تھا کہ ان کے پاس ایک جواب ہے یہ وہی جواب ہے جو ان سے پہلے ہنری ڈیوڈ تھورو، سینٹ فرانسس آف اسی سی، عیسیٰ مسیح، ولیم پین، ولیم لائیڈ گیریسن نے دیا تھا یا خود ان کے زمانے میں ہی ان کے ہمعصروں یعنی لیوٹالسٹائی، جیں آڈمس، رومیوں رولاں البرٹ شوائٹ زر، تویوہیکو کاگاوا نے دیا تھا سب کا جواب ایک ہی تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس جواب کو تفصیل کے ساتھ دینے اور نئے زمانے میں اپنی زندگی میں عمل کرکے دکھانے کی اتنی کوشش نہیں کی جتنی گاندھی نے کی۔ زمانے کے مختلف دوروں میں اسے کئی نام دئے گئے جن میں سے کچھ یہ ہیں۔ اہنسا، عدم انتقام، امن پسندی،۔۔۔ اس جواب کو عام طور پر غلط سمجھا گیا لیکن بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں اسے نئی اہمیت حاصل ہوئی۔

اگر انسان وہ طاقت حاصل کرسکتا ہے جس پر گاندھی عقیدہ رکھتے تھے تو سنجیدگی سے اسے تلاش کیا جانا چاہیے۔ یہ طاقت اسے تباہی سے بچا سکتی ہے کیونکہ موہن داس گاندھی کی زندگی میں اور ان کے اردگرد کے بہت سے لوگوں کی زندگی میں اس طاقت نے اپنی جھلک دکھائی ہے اس نے دنیا کے کئی حصوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ چھوٹا سا آدمی جس نے بظاہر ایک غیر عملی نظریے کو پیش کرکے اتنے برسوں تک ہندوستان کی رہنمائی کی اس کی زندگی پر گہری نظر ڈالنے سے شاید دنیا کو زیادہ حوصلہ حاصل ہو اور وہ جنگ سے نجات حاصل کرنے کا ایک الگ راستہ نکال سکے۔

وہ راستہ ہے تو پرانا ہی لیکن کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر صدیوں میں شاذ و نادر ہی اس کا استعمال ہوا ہے۔

ایک ملک کے رہنے والوں میں قدروں کا جو احساس ہوتا ہے ویسا ہی دوسرے ملک کے باشندوں میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایک مرتبہ ایک بڑھیا کی مصیبتوں کی داستان گاندھی توجہ سے سنتے رہے جبکہ ایک بڑا سیاسی مجمع کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ بہت سے سیاسی لوگوں کو یہ باتیں دیکھ کر الجھن ہوتی تھی لیکن وہ لوگ جن میں زیادہ صبر تھا اور وہ گاندھی کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ "کون جانے کہ قدروں کے متعلق ان کا اندازہ ہمارے مقابلے میں زیادہ صحیح ہو"

قدروں کی پرکھ کا قدرتی رجحان جو مہاتما گاندھی کے ہر کام سے ظاہر ہوتا تھا شاید یہی وہ چیز ہے جس کی دنیا کے اکثر لوگوں کو آج ضرورت ہے اگر وہ چاہتے ہیں کہ کامیابی سے ایسا راستہ نکالیں جس سے ایک نئی عالمی جنگ یا ایک تشدد والے عالمی انقلاب (چاہے وہ انتہا پسند بائیں بازو سے یا انتہا پسند داہنے بازو سے آئے) کے تباہ کن انجام سے بچ سکیں تو نوع انسانی کے لیے گاندھیائی راستہ ہی شاید تنہا صحیح راستہ ہے۔

پی، ڈی ٹنڈن

اور

رویندرائی ولزے

حرف آغاز

مہاتما گاندھی یقیناً دنیا کی عظیم اور انتہائی پرکشش ہستیوں میں سے ہیں اگرچہ ان کے انتقال کو بائیس سال سے زائد ہو چکے ہیں لیکن دنیا کے مختلف حصوں میں ابھی تک ان کے متعلق کتابیں لکھی جا رہی ہیں جو ان کی شخصیت اور ان کے نظریے پر نئی روشنی ڈالتی ہیں یا ان کی زندگی اور ان کے کاموں کے بارے میں نئی معلومات فراہم کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں شاید سب سے اچھی کتاب ان کی 'آپ بیتی' ہے لیکن اس میں انہوں نے سنہ ۱۹۲۰ء تک ہی واقعات کا ذکر کیا ہے اس لیے اس میں ان کی پوری زندگی کی کہانی نہیں ملتی۔ بہر حال جس چیز نے گاندھی جی کو لاثانی بنایا ہے وہ ہے ان کا فلسفہ جس میں ہر مذہب اور اخلاقی تصور کا سنگم ہے۔ انسانی سماج کی نجات اور ترقی کے لیے ان کی خاص دین ان کا اہنسا کا اصول ہے۔ یعنی محبت اور ہمدردی سے تشدد پر فتح حاصل کرنا۔

پروفیسر رونیڈ ائی ولزلے اور شری پی، ڈی ٹنڈن مشہور صحافی اور ممتاز مصنف ہیں۔ ایک امریکی ہیں اور دوسرے ہندستانی جنھوں نے اپنی اس مشترکہ تصنیف میں بڑی محنت اور تحقیق کا ثبوت دیا ہے، میرا خیال ہے کہ موجودہ دور کے ہندوستان میں گاندھی جی کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرنے کے اپنے مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں اور اسی طرح انہوں نے نہ صرف ہمارے اپنے زمانے کے لیے بلکہ اس ایٹمی دور میں پوری انسانیت کے مستقبل کے لیے بھی گاندھی جی کی افادیت کو ثابت کر دکھایا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے نوجوان جو بابو، محبت اور عدم تشدد کے پیغامبر کو جسمانی شکل میں نہیں دیکھ سکے تھے وہ اس کتاب کو پڑھ کر ان کی دلکش شخصیت کا بھرپور اندازہ کر سکیں گے جن کے لیے وہ جیے اور مرے۔

(بال کرشن کیکر)

سنت اور اصول پرست

بعض لوگوں کی نظر میں گاندھی جی ایک بڑے سنت (صوفی) تھے، کچھ کے لیے کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے اور کچھ لوگ انھیں ناقابلِ تقلید اصول پرست سمجھتے تھے مگر جو اُن کو جانتے تھے وہ سب اس حقیقت سے واقف تھے کہ مہاتما گاندھی جسمانی لحاظ سے ایک دبلے پتلے آدمی ہونے کے باوجود روحانی لحاظ سے کافی طاقتور تھے اور حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ انھوں نے اپنے ملک کی رہنمائی کی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے طرزِ زندگی اور لوگوں کے ساتھ ان کے برتاؤ میں کچھ انوکھاپن تھا۔ وہ انوکھاپن یہ تھا کہ انھوں نے انقلاب کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہمیشہ تشدّد (اہنسا) کے بجائے عدمِ تشدّد (اہنسا) کا راستہ اختیار کیا اور انھوں نے لاکھوں کروڑوں لوگوں کا دل اپنے عدمِ تشدد کے اصول کی طرف کھینچ لیا جو لوگ گاندھی جی کے فلسفے یا خیالات کو سمجھتے ہیں ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ شاید عدمِ تشدد ہی ایسا راستہ ہے جس سے اس مصیبت زدہ دنیا کو بچایا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا ایسے جھگڑوں میں پھنس گئی ہے کہ آگے چل کر وہ خوفناک جنگوں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ جنگ کے نئے سائنسی طریقوں کی بنا پر یہ جھگڑے انسانی سماج کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ویٹ نام کا مسئلہ، عرب اسرائیل جنگ یا خطرے کی ایسی ہی اور جگہیں تباہی کا باعث ہو سکتی ہیں۔

جن لوگوں نے گاندھی جی کی تصویریں دیکھی ہیں ان کی نظر میں گاندھی جی کا نقشہ اس طرح آتا ہے کہ وہ ایک لمبے کان والے، عینک لگائے، تقریباً ننگے، اوسط قد کے آدمی ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں نے جنھوں نے ان کی بلند آواز اور ان کی صاف ستھری بولی کے ریکارڈ سنے ہیں وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے اسلحہ استعمال کیے بغیر برطانوی حکومت کا مقابلہ کیا، کامیابی حاصل کی اور اس طرح

اپنے ملک کو آزادی دلائی۔

لاکھوں کروڑوں ایسے لوگ جنھوں نے ان کا نام تک نہیں سنا تھا انھیں گاندھی جی کے بارے میں اس وقت معلوم ہوا جب مختلف ملکوں نے ان کی تصویر والے ڈاک ٹکٹ جاری کیے۔ ان ٹکٹوں میں سے کچھ میں انھیں اہنسا کا پیامبر بتایا گیا۔

گاندھی جی نے ہندوستان میں جو کام کیا شاید اس سے زیادہ اہم کام ان کا وہ اثر ہے جو انھوں نے اپنی عملی زندگی کا نمونہ پیش کر کے پوری دنیا پر ڈالا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے لڑکوں کی باتیں سننے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ گاندھی جی سے متاثر ہیں بلکہ تھورو اور ٹالسٹائی کا بھی ان پر اثر ہے اور وہ ان کے خیالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہمیں اٹھارہ سالہ ایزل بلیر جونیر کی یاد آتی ہے جس کی رہنمائی میں اس کے امریکی ساتھیوں نے نسلی امتیاز کے خلاف مظاہرہ کیا تھا۔ امریکا میں رنگ و نسل کا امتیاز کافی پایا جاتا ہے۔ ایک دن دوپہر کے کھانے کے وقت ایک ہوٹل میں کھڑکی پر کھانا دینے والا آدمی یہ نہیں چاہتا تھا کہ کالے لوگ گوروں کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھائیں۔ یہ دیکھ کر ایزل بلیر نے اس امتیاز کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کے دوران بتایا کہ جب مجھے اور میرے تین ساتھیوں کو کھڑکی پر کھانا نہیں ملا تو ہم نے گاندھیائی طریقہ پر بیٹھ کر احتجاج کیا۔ نوجوان بلیر نے ٹیلی ویژن پر ہندستانی طرزِ زندگی اور ہندستان کی تاریخ کی تصویریں دیکھی تھیں جن سے وہ کافی متاثر ہوا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ گاندھی جی جیل سے رہا ہوتے ہیں اور پھر گرفتار کر لیے جاتے ہیں اور جیل میں بند کر دیے جاتے ہیں، ان کے ساتھ یہ رویہ اُن کے ان خیالات کی بنا پر جن کی بنیاد محبت اور ہمدردی کے اصولوں پر ہے اور اُن طریقوں کی وجہ سے اختیار کیا گیا جن کے پیچھے ہمدردی اور اہنسا کا نقطۂ نظر ہے۔

لگ بھگ اسی زمانے میں مرحوم ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ جونیر نے امریکا میں بتایا تھا کہ اُن کا اپنا خیال کس طرح بدلا تھا۔ ڈاکٹر کنگ گاندھیائی سماجی اصولوں کے

ماننے والے ممتاز نیگرو لیڈر تھے۔ ۱۹۶۴ء میں انھیں امن نوبل پرائز بھی ملا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور اپنے خیالات اور نظریات پر گاندھی جی کے اثر کا اعتراف اور احسان مندی کا اظہار کیا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں 'کرسچین سنچری' نامی ماہنامے میں ڈاکٹر مارٹن لوتھر نے "اہنسا کے مندر کے لیے سفر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ جب وہ بوسٹن یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، وہ گاندھی جی کے خیالات اور نظریات سے واقف ہوئے۔

انھوں نے لکھا ہے "جب میں نے گاندھی جی کے مضامین پڑھے تو میں ان کی عدمِ تشدد والی تحریکوں اور احتجاجوں سے بہت متاثر ہوا۔ مجھے گاندھیائی طرز کی ستیہ گرہ کا تصور بہت ہی اہم محسوس ہوا۔ میں گاندھی جی کے فلسفے کا جتنا گہرا مطالعہ کرتا گیا اتنا ہی میرے ذہن سے محبت کی طاقت کے بارے میں اندیشہ کم ہوتا گیا۔ اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ عیسائی مذہب میں محبت کے جس اصول پر زور دیا گیا ہے اس پر اگر اہنسا کے گاندھیائی ڈھنگ سے چلا جائے تو مصیبت زدہ کمزور لوگوں کے لیے اپنی لڑائی میں محبت کی یہ طاقت بہت کارگر ہتھیار ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر کنگ نے بڑے ڈرامائی انداز میں مانٹ گمری، الاباما میں اس طریقہ پر ۱۹۵۴ء میں عمل کیا۔ انھوں نے نیگرو باشندوں کی پُرامن عدمِ تعاون کی تحریک کی رہنمائی کی اور کامیابی حاصل کی جس کی بنا پر نیگرو باشندے آزادی کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق بسوں پر سفر کرنے لگے۔ اس تحریک کے لیے مشعلِ راہ، گاندھیائی اصول ہی تھے۔ اس طرح ڈاکٹر کنگ کو اہنسا کے طریقے پر پورا بھروسہ اور اعتقاد پیدا ہوگیا۔ ۱۹۶۰ء میں وہ پہلی بار ہندستان آئے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے بتایا کہ قیام کے دوران انھیں جو تجربہ ہوا اس سے اہنسا پر اُن کے اعتقاد میں اور اضافہ ہوگیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اگرچہ گاندھی جی کے انتقال سے اہنسا کی اہمیت میں کچھ کمی آگئی ہے، لیکن پھر بھی بڑی حد تک ان کی پیدا کی ہوئی روح ابھی باقی ہے۔ ڈاکٹر کنگ گاندھیائی نظریات کی حمایت میں تقریریں کرتے اور مضامین لکھتے رہے، یہاں تک کہ انھوں نے جنگ اور

شہری حقوق کی تحریک کے دوران بھی اہنسا کے اصول پر چلنے کی اپیل کی ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر کنگ کے قتل کیے جانے سے دنیا کو سخت دھچکا لگا۔ ان کے قتل سے اہنسا کی طرف لوگوں کی توجہ میں اور اضافہ ہوا، کیونکہ وہ اہنسا کے بڑے علمبردار تھے۔ ۱۹۶۰ء کے ابتدائی دس برسوں میں بے شمار تحریکوں کا آغاز ہوا۔ ان میں سے کچھ تحریکیں تو گاندھیائی اصول پر چلیں اور کچھ نے شروع میں اہنسا کا راستہ اختیار کیا، لیکن بعد کو وہ اس راستے سے ہٹ گئیں۔ کیونکہ اہنسا کے ذریعے سے بُرائی کا مقابلہ کرنا آسان کام نہیں۔ جلسے، جلوس، اجتماع دورے، مظاہرے نیز تشدد کے بغیر مخالفت کے اور دوسرے طریقے کبھی کبھی ناکام بھی ہوئے ہیں اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ صحیح معنوں میں گاندھیائی اصول کے مطابق نہیں تھے یا پھر ایسا ہوا کہ وہ لوگ جو تحریک چلا رہے تھے ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ اس نظم وضبط کی پوری طرح پابندی کرتے جو اہنسا کے اصولوں پر چلائی ہوئی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے۔

جون بائز نام کی ایک امریکی خاتون جو لوک گیت گانے میں بہت مشہور ہیں ہندوستان میں صرف اپنی سریلی آواز ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیالات کی بنا پر بھی کافی مقبول ہیں وہ کیلیفورنیا میں ایک اسکول چلاتی ہیں جس میں مقابلے کے لیے عدم تشدد کے طریقوں کی تعلیم دی جاتی ہے روایتی طور پر امن پسند اور عالمی شہرت رکھنے والے ادارے جیسے فیلوشپ آف کنسی لی ایشن اور ویمنس انٹرنیشنل لیگ فار پیس اینڈ فری ڈم برابر گاندھیائی اصولوں اور طریقوں پر اعتقاد رکھتے چلے آئے ہیں۔

دنیا میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ہے جنہیں لوگ مذاق میں ہپّی کہتے ہیں یہ نوجوان اہنسا پر پکّا عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کے اس عقیدے کی بنیاد گاندھی جی اور دوسری امن پسند شخصیتیں ہیں۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں اہنسا کا فلسفہ پڑھایا جاتا ہے اور وہ لوگ جنہیں امید ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے وہ اسے بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں۔

امریکا کے مشہور رسالے "سٹرڈے ریویو" کے ایڈیٹر جو اکثر ہندوستان جاتے رہتے ہیں، پنڈت نہرو کے دوستوں میں ہیں اور ہندوستان کے بارے میں مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اس وقت دنیا میں "گاندھی جیسی ہستی" موجود نہیں ہے جو اس زمانے میں اپنے طرز پر رہنمائی کر سکے۔ گاندھی جی کے خیالات کا اثر صرف دانشوروں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ عوام میں بھی پایا جاتا ہے اس کا اندازہ اس بات چیت سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ذکر ناول اور

مضمون نگار جان اسٹائن بیک نے اپنی کتاب "ٹراولس ودھ چارلی" میں کیا ہے یہ بات چیت ایک نوجوان نگرو طالب علم کے ساتھ امریکا میں چلنے والے اہنسا پر مبنی پروگراموں کے بارے میں ہوئی تھی۔ اس طالب علم نے دھرنوں اور بس بائیکاٹ کی تحریکوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ جان اسٹائن بیک اور طالب میں یہ بات چیت لوتھر کنگ اور " ان کی پرامن لیکن موثر تحریک " پر تھی۔

طالب علم نے کہا کہ اس کی رفتار بہت سست ہوتی ہے، اور اس میں بہت دیر لگ جائے گی" اس کے جواب میں بیک نے کہا " اس میں سدھار ہے اور لگاتار سدھار ہے۔ گاندھی نے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہی تنہا ہتھیار ہے جو تشدد کے مقابلے میں کامیابی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

نگرو طالب علم نے کہا کہ " یہ سب میں جانتا ہوں اور میں اس کے بارے میں سب کچھ پڑھ چکا ہوں لیکن اس سے ہونے والا فائدہ پانی کی طرح ہے اور وقت نکلتا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کام جلد ہو۔ ابھی ہو اور فوراً ہو"

اس پر بیک نے جواب دیا " آپ کی جلدبازی سے تو سب پروگرام ہی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے "

طالب علم نے کہا " یہ ہو سکتا ہے لیکن کون جانتا ہے کہ میں جوان ہونے سے پہلے ہی بوڑھا ہو جاؤں یا مر جاؤں اس لئے میں جلد سے جلد کام پورا کرنا چاہتا ہوں "

اس پر بیک نے طالب علم سے کہا " آپ نے جو کہا وہ صحیح ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ گاندھی جی کا انتقال ہو گیا ہے مگر کتنے ہیں جو آپ کی طرح کام کرنا چاہتے ہیں "

اس کے جواب میں طالب علم نے کہا۔ " ہاں کچھ تو ہیں اور ضرور ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ کتنے ہیں "

تھوڑی دیر بعد طالب علم چلا گیا لیکن چلتے چلتے اس نے کہا :۔

" میں شرمندہ ہوں، میں نے جو کچھ کہا اس میں خود غرضی تھی لیکن بات یہ ہے کہ میں کام چاہتا ہوں جیتے جی کچھ کرنا چاہتا ہوں، میری خواہش ہے کہ کچھ کام ہو اور جلد ہو "

اہنسا کی راستے کی طرف دنیا کی نظریں کیوں اٹھ رہی ہیں ؟ یہ گاندھی کون تھا جس کا اتنا ذکر جدوجہد کے سلسلے میں برابر کیا جاتا ہے ؟

موہن داس

گاندھی جی کا اپنا خاندان کوئی بڑا خاندان نہیں تھا۔ گاندھی جی کے والد کا نام کرم چند تھا انہی کی نسبت سے گاندھی جی کا نام موہن داس کرم چند گاندھی رکھا گیا گاندھی جی کے والد کرم چند کے پانچ بھائی تھے ان کے اپنے

اپنے بال بچے تھے لیکن پانچوں بھائی ایک ہی ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے ان کے علاوہ کرمچند کے ایک چچا بھی انہی کے ساتھ رہتے تھے۔

گاندھی جی کا تعلق ایک تجارت پیشہ خاندان سے تھا جس کے کچھ افراد سرکاری ملازمت بھی کرتے تھے۔ ان کے والد کو عام طور پر کابا گاندھی، کہا جاتا تھا۔ ان کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی ہوئی۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی سے بھی ایک لڑکی ہوئی لیکن دوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا پھر انہوں نے تیسری شادی کی مگر ان سے کوئی بچہ نہیں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد گاندھی جی کے والد نے چوتھی شادی کی جن کا نام پتلی با تھا لیکن عام طور پر لوگ انہیں پتلی بائی کہا کرتے تھے کیونکہ بائی کے معنی بہن کے ہوتے ہیں۔ پتلی بائی سے گاندھی جی کے والد کابا گاندھی کے چار بچے ہوئے جن میں ایک لڑکی اور تین لڑکے تھے چاروں میں سب سے چھوٹے موہن داس کرمچند گاندھی تھے۔

سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے انہیں سب لوگ بہت چاہتے تھے اور پیار میں موہنیا یا موہن کہا کرتے تھے۔ وہ پوربندر میں ۲ راکتوبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ پوربندر مغربی ہندوستان میں کاٹھیا واڑ کے جنوبی مغربی کنارے پر واقع ہے۔ یہ سمندر کے ساحل پر ایک چھوٹا سا شہر ہے۔

گاندھی جی کا بچپن اپنے دو بھائیوں لکشمی داس عرف کالا، کرسن داس عرف کرسنیا اور رلیت بہن عرف گوکی کے ساتھ گزرا۔ یہ لوگ اس وقت جس مکان میں رہتے تھے اسے ان مکانوں کے مقابلے میں عالیشان محل ہی کہا جا سکتا ہے جن میں گاندھی جی بعد کو اپنی مرضی سے غریبوں جیسی زندگی بسر کرنے کے لئے رہنے لگے تھے۔ وہ سفید پتھر کا بنا ہوا سہ منزلہ مکان تھا اور اس کے چاروں طرف پختہ چہار دیواری تھی مکان کے جس حصے میں گاندھی جی کے والد کرمچند رہتے تھے اس میں دو کمرے، برآمدہ اور باورچی خانہ تھا۔

گاندھی جی کا خاندان ذات کے اعتبار سے بنیا خاندان تھا۔ بنیا لوگ عام طور پر کاروبار کرتے ہیں اس علاقے میں جہاں گاندھی جی پیدا ہوئے تھے وہاں اکثر بنئے پرچون کی دکان رکھتے تھے گاندھی جی کے والد کرمچند کی بھی ایک دکان تھی۔

۲۵ برس کی عمر میں کرمچند گاندھی پوربندر ریاست کے دیوان بنا دیئے گئے۔ یہ عہدہ انہیں اپنے والد اتم چند گاندھی کے انتقال کے بعد ملا اور وہ اس ریاست کے دیوان کی حیثیت سے تیس سال تک کام کرتے رہے۔

بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ پرچون کی دکان کرنے والے آدمی کو ریاست کا دیوان بنا دیا جائے

مگر بات یہ تھی کہ کرم چند گاندھی کے سپرد ریاست کی سیاست سے نپٹنے کا کام اتنا نہیں تھا جتنا کہ اس کے تجارتی معاملات کو دیکھنا اور اس کی تجارت کو آگے بڑھانا تھا۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا کام نہ صرف پوربندر میں بلکہ دو دوسری چھوٹی ریاستوں راجکوٹ اور ونکانیر میں بھی انجام دیا۔

کرم چند گاندھی کی تعلیم زیادہ نہیں ہوئی تھی انہیں دولت جمع کرنے اور پیسے والا بننے سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ اپنے ہندو دھرم کا دل سے احترام کرتے تھے اور اس کی پوری پابندی کرتے تھے جب ان کے سب سے چھوٹے بیٹے موہن داس کرم چند گاندھی پیدا ہوئے اس وقت ان کی عمر لگ بھگ پچاس سال کی تھی موہن نے جب آنکھ کھولی تو والد کو جوانی میں نہیں ادھیڑ عمر میں دیکھا اس لئے وہ شروع ہی سے ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ وہ سعادت مند لڑکوں کی طرح اپنے والد کے حکم کی چپ چاپ پابندی کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کم سن ہونے کی وجہ سے اگر کبھی وہ اپنے والد کی بات نہ مانتا یا ان کی ہدایت کے خلاف کوئی بات کرتا تو اس کا ضمیر اس کی ملامت کرتا اور وہ فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلیتا۔ ایک مرتبہ موہن کے ایک بھائی کو کسی کا قرض ادا کرنے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی تو موہن نے بھائی کے اشارے پر گھر سے تھوڑا سا سونا چرالیا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ اپنے کو مجرم محسوس کرنے لگا اور آخرکار اس نے اپنے والد کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اپنی غلطی کا اعتراف اور ندامت کا اظہار کیا نیک دل بیٹے کا خط پڑھ کر باپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے باپ کو روتا دیکھ کر موہن بھی ضبط نہ کرسکا اور وہ بھی رونے لگا اس طرح آنسوؤں نے بیٹے کی غلطی اور باپ کا دکھ دھو ڈالا۔ موہن بچپن ہی سے نیک اور دیانت دار تھا وہ کبھی جھوٹ نہ بولتا اسی لئے دوسرے لڑکے اسے اپنی شرارتوں میں شریک نہ کرتے اور نہ وہ خود شریک ہونا چاہتا وہ کبھی ایسا کام نہ کرتا جس میں کمینہ پن یا نیچے پن کی بو آتی ہو۔

ایک بار موہن نے اپنے ایک چچا کو سگریٹ پیتے دیکھا جب انھوں نے سگریٹ پی کر ٹکڑا پھینک دیا تو اس نے اٹھا کر پینا شروع کر دیا اس طرح اسے سگریٹ کا چسکا لگ گیا سگریٹ پینے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہاں سے آتے اس لئے وہ گھر کے دوسرے لڑکوں کی مدد سے نوکر کی جیب سے پیسے چرانے لگا لیکن اس چوری سے اتنے پیسے نہ مل پاتے جس سے پوری طرح سگریٹ کا شوق پورا ہو سکتا موہن نے اپنے ساتھیوں سمیت شوق پورا کرنے کے لئے کسی زہریلے پتے کی سگریٹ بنا کر پینا شروع کر دیا جس کا بہت خراب اثر ان لڑکوں کی صحت پر پڑا اب ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اتنا زیادہ ہوا کہ وہ سب خودکشی پر آمادہ ہوگئے مگر جب یہ لوگ خودکشی کرنے چلے تو ہمت نے جواب دے دیا۔ وہ خودکشی تو نہ کرسکے لیکن اس دن سے انھوں نے سگریٹ پینا بالکل چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی سب حرکتوں کا اقرار کرلیا موہن نے اپنے والد کے پاس جاکر ایک ایک بات بتادی اور شرمندگی ظاہر کی۔

موہن داس جب ۱۶ سال کے تھے اس وقت ان کے والد کرمچند گاندھی کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے پیارے بیٹے کی جوانی نہ دیکھ سکے موہن کی ماں پتلی بائی بھی اپنے شوہر کے انتقال کے ایک دو سال کے اندر ہی اس دنیا سے چل بسیں وہ ایک مذہبی ہندو خاتون تھیں جن کی تمام سرگرمیاں گھر اور مندر تک محدود تھیں وہ اپنے مذہب کی پوری پابندی کرتی تھیں اکثر برت رکھا کرتیں دوسری عورتوں کی طرح اگر وہ چاہتیں تو شوہر کے بڑے عہدے پر ہونے کی وجہ سے اپنے کو سونے چاندی کے زیوروں سے لاد سکتی تھیں لیکن انھیں اس قسم کا کوئی شوق نہیں تھا وہ دل کی سخی تھیں اور خود تکلیف اٹھاکر دوسروں کی مصیبت میں کام آتیں۔ انہیں اپنے بچوں اور شوہر سے بڑی محبت تھی وہ ان کی خوشی کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتی تھیں جب پتلی بائی کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے موہن داس ولایت میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

موہن داس اپنی ماں پتلی بائی سے بہت متاثر تھے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "آئندہ چل کر مہاتما بننے میں ماں کے کردار کا بہت اثر پڑا" جب ہم دیکھتے ہیں کہ موہن داس بڑے خلوص سے ہر کام کرتے تھے برت اور عبادت کا رجحان رکھتے تھے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے تو اس خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ان پر اپنی ماں کا کافی اثر تھا۔ ان پر ماں کا نہ صرف تعمیری اثر پڑا یعنی نیک کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا بلکہ بُرے کاموں سے پرہیز کرنے کی عادت بھی انہی سے ملی مگر اسی کے ساتھ ساتھ موہن میں اندھا عقیدہ نہیں پایا جاتا تھا جیسا ان کی ماں میں تھا اور وہ چھوت چھات اور ذات پات کی قائل تھیں لیکن موہن کو ان باتوں سے نفرت تھی۔

موہن کی پرورش اور تربیت پوربندر میں ہوئی۔ پوربندر کو "سفید نگری" بھی کہا جاتا تھا کیونکہ وہاں سفید پتھر کی بہت سی عمارتیں تھیں لیکن اس شہر کی سڑکیں گلیوں کی طرح تنگ تھیں وہاں سے لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر بحر عرب لہریں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ ۱۷۷۷ء میں موہن داس کے پردادا ہرجیوی نے اس خاندانی مکان کو خریدا تھا یہ مکان اب تک صحیح سلامت ہے موہن داس کے دادا اوتم چند کے چھ لڑکے تھے اور مشترکہ خاندان کے رواج کے مطابق ان سب کے بال بچے اسی بڑے مکان میں ساتھ ساتھ رہتے تھے لیکن سب بھائیوں کا کھانا الگ تھا۔

موہن داس سات برس کی عمر میں پرائمری اسکول میں جانے لگے اسکول گھر سے دور نہیں تھا لڑکپن میں موہن داس کا نقشہ اس طرح کا تھا چوڑا ماتھا، لمبے کان، چمکیلی پرکشش آنکھیں اور دبلا پتلا چہرہ چونکہ وہ گھر میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے گھر والے پیار سے انہیں 'منو' بھی کہا کرتے تھے۔

پرائمری اسکول سے نکلنے کے بعد موہن داس نے تین سال تک راجکوٹ کے ایک انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ راجکوٹ، پوربندر کے قریب ہی ایک ریاست تھی جہاں بعد کو موہن داس کے والد

کرمچند دیوان ہوگئے تھے ۔ راجکوٹ کے بعد موہن داس کاٹھیاواڑ کے الفریڈ ہائی اسکول میں داخل ہوئے ۔ یہ ایک بڑا اسکول تھا اور اس کی عمارت کافی شاندار تھی جس سال موہن کے والد کا انتقال ہوا اسی سال انہوں نے وہاں کی پڑھائی ختم کردی ۔

جب وہ چودہ برس کے تھے اور الفریڈ اسکول میں پڑھتے تھے تو ایک دن ہیڈ ماسٹر نے پوچھا :-

"گذشتہ سنیچر کو تم ورزش کرنے کیوں نہیں آئے ؟"

موہن نے جواب دیا" میں اپنے بیمار باپ کی تیمارداری کر رہا تھا ۔ بادل چھائے ہوئے تھے گھڑی میرے پاس تھی نہیں اس لئے وقت کا کوئی اندازہ نہ ہوسکا اور جب میں اسکول پہونچا تو سب لڑکے جا چکے تھے "

ہیڈ ماسٹر نے ڈانٹ کر کہا " جھوٹ بولتے ہو "

موہن جھوٹ نہیں بول رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ ہیڈ ماسٹر کو کس طرح مطمئن کرے جھوٹ کا نام سن کر موہن کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ یہی لڑکا آئندہ چل کر کچھ برسوں بعد اپنی جسمانی اور روحانی طاقت کا ایسا مظاہرہ کرنے والا تھا جو دوسروں کے بس کی بات نہیں ۔

موہن ہمیشہ اسکول ٹھیک وقت پر جاتا اور چھٹی ہوتے ہی سیدھا گھر واپس آتا ۔ وہ حساب میں کچھ کمزور تھا ۔ وہ بہت جلد جھینپ جاتا تھا کیونکہ اسے یہ خیال رہتا تھا کہ کہیں کوئی اس پر ہنس تو نہیں رہا ہے وہ عام طور پر اپنے ٹیچروں کے حکم کی پابندی کرتا تھا حالانکہ بعد کی زندگی میں وہ ایک باغی کی حیثیت سے نمایاں رہا ۔ جیساکہ کہا جاچکا ہے کہ وہ اپنے ٹیچروں کی بات کبھی نہیں ٹالتا تھا لیکن ایک بار ایسا ہوا کہ معائنے کے وقت اس کے ٹیچر نے پیر کی ٹھوکر مار کر موہن سے اشارہ کیا کہ وہ پاس بیٹھے ہوئے لڑکے کی کاپی دیکھ کر اپنے لکھے ہوئے لفظ کے ہجے درست کرلے تاکہ ٹیچر کے درجے میں اچھے کاریکارڈ خراب نہ ہو مگر موہن نے ٹیچر کی یہ بات نہیں مانی اور نقل کرنے سے انکار کردیا ۔

موہن کو باغبانی سے کافی دلچسپی تھی ۔ خود گھر میں پھول ، پودے لگے تھے اور راجکوٹ کے مکان میں تو چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا ۔ اس کی وہ دیکھ بھال کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے باغبانی سے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہی ہوتا گیا ۔

پوربندر کے پاس بھاؤنگر میں سامل داس کالج تھا ۱۸۸۸ء میں موہن داس نے اس کالج میں داخلہ کرایا ۔ کالج میں پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی موہن داس کی مادری زبان گجراتی تھی لیکن اس نے کام چلانے بھر کی انگریزی بھی سیکھ لی تھی ۔

سامل داس کالج میں لکچر انگریزی میں ہوتے تھے جو اس کی سمجھ میں نہیں آتے تھے اس لئے اس نے

وہاں پڑھنا چھوڑ دیا اور کہا کہ میں ولایت جاکر تعلیم حاصل کروں گا۔ برطانیہ کی طرح ہندوستان میں بھی کچھ عرصے سے اونچے درجوں میں پڑھائی لکچر کے ذریعہ ہوتی تھی اور لمبے لمبے امتحانات پاس کرنے کے بعد ہی ترقی ملتی تھی جہاں تک موہن داس کا تعلق ہے اس کی انگریزی تعلیم صرف کتابی تھی اس لئے اسے لکچر سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔

موہن داس اور کستوربا بائی

موہن داس گاندھی کی شادی تیرہ برس کی عمر میں کستوربا مکنجی نام کی لڑکی سے ہوگئی شادی کے وقت کستوربا کی بھی عمر لگ بھگ یہی تھی اتنی کم عمر میں شادی مغربی ممالک کے لوگوں کے لئے تعجب خیز ہو سکتی ہے لیکن یہاں کے لئے ایسا نہیں تھا۔ اس زمانے میں ماں باپ اپنے بچوں کی شادی بچپن ہی میں طے کر دیا کرتے تھے آج کل تو لڑکے خود اپنے لیے لڑکیاں تلاش کر لیتے ہیں لڑکیاں بھی ایسا کرنے لگی ہیں لیکن اتنا نہیں جتنا کہ لڑکے پہلے زمانے میں لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے بالکل انجان ہوتے تھے اور ماں باپ ان کی شادی کر دیتے تھے بعد کو وہ ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے تھے۔ اب مشترکہ ہندو خاندان کم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور شادی کے بعد بیٹا اور بہو ماں باپ سے الگ رہنے لگتے ہیں۔

کستوربائی گوکل داس مکنجی کی بیٹی تھیں وہ پوربندر میں تجارت کرتے تھے اور گاندھی خاندان سے ان کی راہ و رسم تھی۔ موہن داس نے بچپن میں شادی کے فرائض کے متعلق پڑھا تھا ان میں سے سب زیادہ اہم فرض اسے وفاداری معلوم ہوئی تھی موہن ہندو مذہب کے اس اصول سے بھی کافی متاثر ہوا تھا .... "کہ بیوی کا مذہبی فرض اپنے شوہر کے حکم کی پوری پوری پابندی کرنا ہے" موہن کو یہ بات بہت پسند آئی تھی کیونکہ اس طرح وہ بیوی سے اپنی ہر بات منوا سکیں گے اور کوئی اُن سے جواب طلب کرنے والا نہیں ہوگا۔ لیکن آگے چل کر انہوں نے شادی کے بارے میں اپنے خیالات میں زبردست تبدیلی کی۔

مگر جب ۱۸۸۲ء میں ان کی اور کستوربائی کی شادی ہوئی تو ان کے خیالات بڑے دقیانوسی تھے موہن داس ان کے بھائی کرسن داس اور ان کے چچیرے بھائی تینوں کی شادی ایک وقت میں پوربندر میں رہنے والی لڑکیوں کے ساتھ ہوئی تھیں۔ تینوں کی شادیاں ایک ساتھ خرچ میں کفایت کے خیال سے کی گئی تھیں۔ اگر الگ الگ تینوں کی شادیاں کی جاتیں تو خرچ تین گنا ہوتا۔ ہندوستان میں آج کل بھی کہیں کہیں شادی میں بہت خرچ کیا جاتا ہے۔ شادی کے دوران طرح طرح کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں اور اس طرح شادی کی تقریب کئی دن تک جاری رہتی ہے لڑکی والوں کو جہیز بھی دینا ضروری ہوتا ہے۔ لڑکی کی شادی میں لڑکی والا اخراجات کی زیادتی سے قرض کے بوجھ سے

اتنا دب جاتا ہے کہ برسوں گردن نہیں اٹھاپاتا لیکن اب یہ رواج تیزی سے ختم ہو رہا ہے ۔

شادی کے بعد موہن نے اپنی بیوی کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ شروع کیا لیکن کستور بائی بھی ان لڑکیوں میں نہیں تھیں جو آنکھ بند کر کے شوہر کے اشارے پر چلنے لگتی ہیں ۔ وہ ارادے کی پختہ تھیں لیکن خاموش طبیعت کی تھیں اس لئے بظاہر وہ دبو معلوم ہوتی تھیں مگر ان میں قوتِ برداشت غیر معمولی تھی اسی لئے وہ اپنے صبر و تحمل سے اکثر اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جاتی تھیں ۔ وہ غیر معمولی طبیعت رکھنے والے اپنے شوہر کو اچھی طرح سمجھ نہیں پائی تھیں ۔ موہن داس اپنے دل میں سماج کو بدلنے کا جذبہ رکھتے تھے بیس[2] سال کی عمر ہی سے ان کے خیالات ایک خاص فلسفیانہ رخ اختیار کر رہے تھے ان خیالات کو معلوم کر کے پہلے تو کستور بائی کو بڑا دھچکا لگا لیکن رفتہ رفتہ وہ ان کا احترام کرنے لگیں اور آگے چل کر تو وہ موہن داس کی تمام اسکیموں میں ان کا پورا ساتھ دینے لگیں اگرچہ ایسا کرنے میں انہیں اکثر دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور مصیبت بھی جھیلنی ہوتی تھی۔

موہن داس کی شادی بچپن میں ہوئی تھی لیکن بعد میں انہوں نے . . . . . اس رواج کی سخت مخالفت کی اپنی " خود نوشت سوانح عمری " "تلاشِ حق" میں انہوں نے لکھا ہے کہ " اتنی کم عمری کی شادی کے لئے انہیں کوئی اخلاقی جواز نہیں ملتا " ۱۳ سال کی عمر میں ان کی سگائی نہیں بلکہ شادی ہو گئی تھی ، سگائی تو صرف ایک وعدہ ہوتا ہے جو توڑا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے لئے لڑکی لڑکے سے صلاح تک نہیں لی جاتی اس کی نوعیت دونوں کے والدین کے درمیان ایک اقرار نامے کی سی ہوتی ہے ۔ کافی دنوں کے بعد موہن داس کو معلوم ہوا کہ اس طرح کی سگائی تو شادی سے پہلے تین بار ہو چکی تھی اس میں سے پہلی سگائی جب ہوئی تو ان کی عمر صرف سات سال کی تھی یہ تینوں سگائیاں اس لیے ختم ہو گئیں کہ اتفاق سے تینوں لڑکیوں کا انتقال ہو گیا ۔ تینوں لڑکیوں کا انتقال بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ اس زمانے میں بچوں کی موتیں بہت ہوا کرتی تھیں ۔

موہن داس اور کرسن داس دونوں بھائی شادی کے لئے راجکوٹ سے سوا سو میل کا سفر کر کے پوربندر گئے وہاں بارات میں ان کے چچیرے بھائی بھی شامل ہو گئے ۔ موہن داس اور کستور بائی دونوں شادی کے رنگین موقع پر بچے تھے لیکن انہیں بالغوں کی طرح حصہ لینا پڑا دونوں کو بتا دیا گیا تھا کہ شادی کے دوران اور اس کے بعد انہیں کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے ۔ دونوں کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا واقعی کیا مطلب ہے شادی کی رسم گاندھی خاندان کے پوربندر والے مکان کے سامنے ایک چھوٹی سی کھلی جگہ میں ادا کی گئی ۔ گلیوں میں ہوتی ہوئی بارات کستور بائی کے گھر پہنچی جو زیادہ دور نہیں تھا انہوں نے شادی کی رسم پوری کی اور ایک دوسرے کو مٹھائی کھلائی جیسا کہ تقریب کے آخر میں ہوتا ہے ۔

موہن داس کی دلی تمنا تھی کہ ان کی بیوی پڑھ لکھ جائے وہ خود کستور بائی کو پڑھانا چاہتے تھے لیکن اپنی

سماجی زندگی اور دوسرے کاموں کی وجہ سے بہت کم وقت نکال پائے جس کی وجہ سے کستور بائی پوری طرح تعلیم حاصل نہ کر پائیں نہ خود پڑھانے کی فرصت تھی اور نہ ماسٹر رکھنے کی حیثیت۔ اس کے علاوہ کستور بائی اکثر اپنے میکے چلی جاتی تھیں شادی کے کچھ عرصے بعد موہن داس وکالت پڑھنے کے لیے ولایت چلے گئے مگر دور رہنے کے باوجود دونوں کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

شادی کے چھ سال بعد ان کے پہلے لڑکے ہیرا لال پیدا ہوئے بعد میں تین بچے اور ہوئے تینوں لڑکے تھے جن میں سے منی لال ۱۸۹۲ء میں رام داس ۱۸۹۷ء میں اور اس کے تین سال بعد دیوداس پیدا ہوئے۔

۴۔ ولایت میں

موہن داس کے خاندان والوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ موہن داس ۱۸ سال کی کچی عمر میں ولایت جانا چاہتے ہیں تو پورے خاندان میں ہنگامہ مچ گیا۔ غیر ملک میں جانے کا خیال پرانے طرز پر سوچنے والوں کے لیے ہندو دھرم کے خلاف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ان کی برادری لوگوں نے یہ سنا تو انہوں نے موہن داس کو ذات باہر کر دیا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ غیر ملک کے لوگوں کے ساتھ رہنے سے اس کو بھی چھوت لگ جائے گی اور یہ بے دھرم ہو جائے گا۔

ماں کو بھی اس کا ڈر تھا کہ لڑکا ولایت جا کر بے راہ ہو جائے گا لیکن خاندان سے پرانی راہ و رسم رکھنے والے اور ہمدرد جین سادھو بیچر جی سوامی نے موہن داس کی مدد کی انہوں نے کہا کہ اگر وہ تین چیزوں سے پرہیز کی قسم کھا لے تو اسے ولایت جانے کی اجازت دے دی جانی چاہیے۔

نہ تو گوشت کھائیں گے نہ شراب پییں گے اور نہ عورت کو ہاتھ لگائیں گے قسم کھانے کے بعد ماں نے خوشی خوشی جانے کی اجازت دے دی۔ موہن داس نے بڑے خلوص اور ایمانداری سے اپنی قسم کی پابندی کی اب رہا خرچ کا معاملہ تو موہن داس کے بڑے بھائی لکشمن داس ان کا خرچ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے قرض لے کر چھوٹے بھائی کے جانے کا انتظام کر دیا ان کے علاوہ موہن داس کے دوستوں نے بھی ان کی مدد کی۔ ذات برادری کے لوگوں کی مخالفت برابر جاری رہی لیکن انہوں نے کسی کی پروا نہیں کی وہ شروع ہی سے باغی طبیعت کے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ موہن داس نے روایت، اندھے عقیدے اور کٹرپن سے ٹکر لی ۴ ستمبر ۱۸۸۸ء کو وہ اپنی برادری کے پرانے خیال کے لوگوں کی مخالفت کے باوجود انگلینڈ روانہ ہو گئے وہ وکیل بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزی حکومت ہونے کی وجہ سے انگلینڈ کی ڈگری کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ موہن داس نے انگلینڈ میں رہ کر تین سال تک وکالت کی تعلیم حاصل کی وہاں قیام کے دوران اُن

کے خیالات میں کافی تبدیلی ہوئی اس وقت وہ ایک دنیادار نوجوان کی طرح تھے جو پیسہ کمانا اور آرام سے رہنا چاہتا ہے ان کے دماغ میں اس وقت نہ تو انسانی خدمت کا خیال تھا اور نہ ملک کے مستقبل کی فکر۔

جب وہ لندن میں رہنے لگے تو انہوں نے اپنے لیے ایک شاندار دکان سے عمدہ قسم کا لباس خریدا۔ اس وقت ان کی شکل اس شکل وصورت سے بالکل مختلف تھی جس سے پوری دنیا واقف ہے۔ وکالت پڑھنے والے گاندھی فیشنیبل کوٹ کالا پنٹ، چمڑے کے جوتے پہنتے تھے اور ہاتھ میں چاندی کی شام لگی ہوئی چھڑی رکھتے تھے ان دنوں یہی رواج تھا۔ انہوں نے فیشن کے مطابق مونچھیں بڑھالی تھیں مانگ بائیں طرف سے نکالتے تھے اور پھرتیلے بننے کی کوشش کرتے تھے۔

کئی مہینے وہ اس طرح رہے جیسے ان کے خیال میں ایک انگریز کو رہنا چاہیے۔ وہ بہترین قسم کے نئے نئے سوٹ پہنتے اور دور سے چمکنے والی سونے کی دہری زنجیر کی جیب گھڑی لگاتے تھے۔ تقریری مقابلوں اور ناچ گانے کی تقریبوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔

اس درمیان وہ پڑھائی میں پچھڑنے لگے اور زبان کے امتحان میں جب وہ پہلی بار بیٹھے تو فیل ہوگئے لیکن دوسری بار پاس ہوگئے ہاں وکالت پڑھنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ انیسویں صدی کے وسط میں وکالت پاس کرنا جتنا آسان تھا۔ اتنا اب نہیں ہے۔ انہوں نے جی کڑا کر بڑی محنت سے وکالت کی تعلیم حاصل کی اور امتحان پاس کرلیا۔ لیکن وہاں انہیں صرف برطانی قانون پڑھایا گیا۔

کچھ عرصے بعد ان کا دھیان پڑھائی کے علاوہ دوسری باتوں کی طرف بھی گیا انہوں نے مذہب اور فلسفے سے دلچسپی لینی شروع کی وہ ایک سبزی خور تبلیغی جماعت کے جلسوں میں جانے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی دلچسپی بڑھتی گئی گوشت سے پرہیز کرنا اور صرف سبزی کھانا تو ہندو دھرم کا ایک ضروری جزہے لیکن اس وقت تک انھوں نے مذہب پر زیادہ غور کیے بغیر یونہی مان لیا تھا اور اس کی گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سوچ وچار صدیوں سے ہندوستان کی مذہبی زندگی کا ایک اہم حصہ رہا ہے اس لیے گاندھی کو اس کے اپنانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

کھانا پکانے کی طرف بھی انہوں نے توجہ کی ہندوستان میں انہوں نے کبھی کھانا نہیں پکایا تھا لیکن ولایت میں اس کی آزمائش کی۔ وکالت پڑھنے کے زمانے میں وہ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا خود پکانے لگے انہوں نے لندن میں ایک اسٹو خرید لیا اور اسی پر اپنا کھانا اور ناشتہ پکانے لگے ان کے کھانے پر روزانہ صرف ایک شلنگ تین پنس خرچ ہوتے یعنی لگ بھگ سوا روپیہ۔ جیسے جیسے سبزی خوری پر ان کا عقیدہ بڑھتا گیا ویسے ہی ان کی غذا میں تبدیلی ہوتی گئی۔

۱۸۹۱ء میں ہندوستان واپس آنے کے بعد موہن داس نے ایک باورچی نوکر رکھ لیا لیکن اس کے باوجود آدھا کام انہیں خود کرنا پڑتا تھا کیونکہ کھانا پکانے والے مہراج کو کھانا پکانے کا زیادہ سلیقہ نہیں تھا۔ موہن داس نے اسے آگے چل کر جب وہ آشرموں میں رہنے لگے تو انہوں نے کھانا پکانے کے کام کو مختصر بنانے کی کوشش کی انہیں باورچی خانے میں گھنٹوں کام کرتے رہنا پسند نہیں تھا اسے وہ پیٹ کی غلامی کہا کرتے تھے اس زمانے کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ موہن داس گاندھی بہت سی چیزیں جیسے چاول، شوربے دار ترکاری، صلاد، حلوا، دلیا، کھیر اور گیہوں کافی تیار کر لیتے تھے۔

ہندوستان واپس آنے تک گاندھی جی کو خوبصورت فیشنیبل نوجوان بننے کا شوق باقی نہ رہا تھا وہ سادہ لباس پہننے اور سادگی سے رہنے لگے تھے۔ ولایت میں وکالت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وہ لوٹے تو انہیں پتہ چلا کہ ان کی ماں کا انتقال اسی وقت ہو گیا تھا جب وہ لندن میں تھے لیکن انہیں اس لیے بتایا نہیں گیا تھا کہ اس سے ان کی پڑھائی میں خلل پڑے گا۔ انہیں ماں کے انتقال کے متعلق معلوم کر کے بہت رنج ہوا۔ وہ بمبئی سے راجکوٹ گئے جہاں اب پورا خاندان رہتا تھا۔ لیکن جلد ہی وکالت شروع کرنے کے خیال سے وہ بمبئی پھر لوٹ آئے۔ وکالت شروع کرنے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ انہوں نے لندن میں برطانی قانون کے متعلق تو بہت کچھ پڑھا لیکن ہندوستانی قانون میں وہ کورے ہی رہے اس لیے انہوں نے فوراً ہندو اور مسلم قانون پڑھنا شروع کر دیا۔

انہوں نے عدالت میں پہلا مقدمہ مالی بائی نامی ایک غریب بیوہ کا کیا۔ اس میں انہیں افسوسناک تجربہ ہوا جب وہ اپنے مؤکل کی طرف سے عدالت میں بولنے کے لیے کھڑے ہوئے تو جیسے ان کی زبان ہی بند ہو گئی اور بالکل بول نہ سکے انہوں نے بیوہ کو تیس روپئے واپس کر دئے جو انہیں فیس کے بطور ملے تھے اور مقدمہ دوسرے وکیل نے کیا۔ انہیں اس واقعہ سے اتنی ناامیدی ہوئی کہ انہوں نے راجکوٹ واپس جانے کا فیصلہ کیا وہاں وہ عرضیاں اور دستاویزیں لکھ کر تیس روپئے ماہوار کمانے لگے لیکن برابر انہیں یہ احساس ستانے لگا کہ وہ بالکل ناکام ہو گئے جس کی وجہ سے وہ کافی رنجیدہ رہنے لگے اور سوچنے لگے کہ وہ وکالت کریں یا یہ پیشہ چھوڑ کر ٹیچر بن جائیں۔

اسی اثنا میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کا ان کی زندگی پر بہت اثر پڑا اس کو انہوں نے "زندگی کا پہلا سانحہ کہا ہے" ان کے بھائی لکشمن داس جنہوں نے ولایت میں ان کی پڑھائی کا خرچ برداشت کیا تھا ان دنوں پوربندر کے راجا کے سکریٹری اور مشیر تھے اُن پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے غلط صلاح دی اس سلسلہ میں انہوں نے موہن داس سے مدد چاہی اور کہا کہ پوربندر کے انگریز افسر سے مل لو جو سیاسی ایجنٹ کی حیثیت

سے کام کررہا ہے موہن داس جب انگلینڈ میں تھے تب سے اس انگریز سے ان کی جان پہچان تھی اور خیال یہ تھا کہ وہ لکشمی داس کے خلاف ہے۔ موہن داس کو اس افسر سے ملنا پسند نہیں تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جان پہچان کا ناجائز فائدہ اٹھایا جائے لیکن ان کے بھائی لکشمن داس نے اصرار کیا کہ وہ اس سے جاکر مل لیں موہن داس کے لیے ان کی بات ٹالنا ممکن نہ تھا اس لیے وہ بادلِ ناخواستہ گئے انہیں کچھ شبہہ بھی تھا جو آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔

انگریز افسر سے ملنے کے لیے وقت لیا جب وہ اس کے پاس گئے تو وہ بے رُخی سے پیش آیا وہ کچھ ناراض معلوم ہوتا تھا۔

اُس نے بگڑ کر کہا " تمہارا بھائی سازش کیا کرتا ہے " میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا میرے پاس فاضل وقت نہیں ہے اگر تمھارے بھائی کو کچھ کہنا ہو تو باقاعدہ لکھ کر بھیج دیں "

موہن داس گاندھی اپنی بات پر اڑے رہے تب وہ افسر غصّے سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور پھر کر بولا " یہاں سے نکل جاؤ " لیکن موہن داس نے کہا " آپ میری بات تو سُن لیجئے " اس پر انگریز افسر آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے چپراسی کو آواز دی اور حکم دیا کہ موہن داس کو باہر نکال دے ۔

موہن داس کو اس برتاؤ پر بڑا غصّہ آیا۔ انہوں نے گھر آکر افسر کے پاس ایک تحریر بھیجی اس میں لکھا کہ " آپ نے میری توہین کی اپنے چپراسی کے ذریعہ مجھ پر حملہ کرایا اگر آپ معافی نہیں مانگیں گے تو مجھے آپ کے خلاف کارروائی کرنی پڑے گی "۔

افسر نے اپنے جواب میں موہن داس پر بدتمیزی کا الزام لگایا اس نے کہا " میں نے آپ سے جانے کے لیے کہا لیکن آپ نے نہیں سنا اس کے بعد میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ چپراسی کے ذریعہ آپ کو باہر نکلوا دوں اور جب اس نے آپ سے دفتر چھوڑنے کو کہا تب بھی آپ نہیں مانے اس لیے اس نے ٹھیک اتنی طاقت استعمال کی جتنی آپ کو باہر نکالنے کے لیے ضروری تھی آپ جو کارروائی کرنا چاہیں کرسکتے ہیں "

موہن داس نے یہ محسوس کرکے کہ وہ محض ایک چھوٹے بیرسٹر ہیں ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کریں انہوں نے ایک تحریر لکھی اور اس کے بارے میں ہندوستان کے ایک بہت مشہور وکیل سر فیروز شاہ مہتا سے ان کی رائے معلوم کی جو اس وقت راجکوٹ آئے ہوئے تھے سر فیروز شاہ نے کہلوایا کہ موہن داس کو چاہیئے کہ وہ اپنی تحریر کو پھاڑ کر پھینک دیں اور جو زیادتی ہوئی ہے اسے چپ چاپ پی جائیں۔ انگریز افسر کے خلاف کارروائی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس لیے خود انہیں نقصان پہونچ جائے گا۔ موہن داس سے کہہ دو کہ اسے بھی زندگی میں بہت کچھ سیکھنا اور سمجھنا ہے۔

اس پر گاندھی جی نے بعد میں لکھا کہ " یہ صلاح میرے لئے زہر کی طرح کڑوی تھی لیکن مجھے نگل جانی پڑی میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اب میں آئندہ کبھی ایسے جھنجھٹ میں نہیں پڑوں گا اس تلخ تجربے نے میری زندگی کا راستہ ہی بدل دیا "

۵۔ جنوبی افریقہ میں توہین آمیز برتاؤ

سیاسی (پولٹیکل) ایجنٹ سے موہن داس گاندھی کا جو جھگڑا ہوا اس کی بنا پر وکالت پڑھنے کی امید بالکل ختم ہو گئی ان دنوں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے سیاسی جھگڑے سارے کاٹھیاواڑ میں ہوتے رہتے تھے ۔

۱۸۹۳ء میں ایک دن لکشمن داس کے پاس ایک مقامی تاجر دادا عبداللہ اینڈ کمپنی کا ایک خط آیا اس میں لکھا تھا کہ جنوبی افریقہ میں ان کا ایک بڑا مقدمہ چل رہا ہے یہ مقدمہ لگ بھگ پانچ لاکھ روپے کے بارے میں ہے اس خط میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ دکان کے مستقل وکیل کی مدد کے لیے موہن داس گاندھی کو بھیج دیجئے حال ہی میں جس مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کی بنا پر موہن داس جنوبی افریقہ جانے کے لئے تیار ہو گئے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ کام قریب قریب ایک سال کا ہے ، فرسٹ کلاس کا کرایہ اور پندرہ ہزار روپے فیس کے ملیں گے ۔

موہن داس گاندھی جنوبی افریقہ کے لیے جہاز سے روانہ ہوئے وہ جب ڈربن بندرگاہ پر اترے تو وہ ایک فراک کوٹ پہنے تھے اور پگڑی باندھے تھے ان کا یہ لباس اس لباس سے کہیں زیادہ مہنگا تھا جو جنوبی افریقہ جانے والے ہندوستانی اس زمانے میں پہنتے تھے ۔

آنے کے کچھ دنوں بعد موہن داس ڈربن کی کچہری لے جائے گئے یہاں بھی ایک ایسا واقعہ ہوا جیسا جابر برطانی حکومت کے ہاتھوں ہندوستان میں ہوا تھا اس سے بھی نوجوان ہندوستانی وکیل کے دل کو سخت دھکا لگا۔ جب وہ سر پر پگڑی باندھے عدالت کے سامنے گئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ مجسٹریٹ ان کی طرف گھور کر دیکھ رہا ہے اور اشارہ کر رہا ہے کہ پگڑی اتار دو موہن داس گاندھی نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور عدالت کے باہر چلے آئے۔

بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ عدالت میں صرف مسلمانوں والی ٹوپی پہن کر جانے کی اجازت ہے اسی کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی پتہ چلا کہ یہاں ہندوستانیوں کو عام طور پر " قلی " کہا جاتا ہے چنانچہ انہیں بھی " قلی ' وکیل کہا جانے لگا موہن داس گاندھی نے سوچا کہ وہ بے عزتی سے بچنے کے لیے انگریزی ہیٹ وغیرہ پہن سکتے ہیں لیکن ان کے ہندوستانی دوستوں نے کہا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم لوگ جو پگڑی پہننے کا عزم رکھتے اور ہمیں حق ہے خطرے میں پڑ جائیں گے اس لیے انھوں نے نہ صرف یہ کہ پگڑی پہننا جاری رکھا بلکہ عدالت میں ہونے والے واقعہ کے بارے میں نیٹال کے اخباروں کو لکھا بھی اس طرح وہاں کے اخباروں میں اس کی بحث چل پڑی اور سارے

جنوبی افریقہ میں گاندھی کی آمد کا چرچا ہو گیا۔

اس دوران وہ اس مقدمے کی تیاری کرتے رہے جس کے لیے جنوبی افریقہ بلائے گئے تھے معاملے کو طے کرنے کی کوشش کرنے کے لیے انہوں نے پری ٹوریا جانے کا فیصلہ کیا اور فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر ٹرین میں سوار ہو گئے جب گاڑی نیٹال کی راجدھانی ماٹزبرگ پہنچی تو ایک گورا مسافر گاندھی کے ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نے یہ دیکھ کر کہ فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوا مسافر گورا نہیں بلکہ ہندوستانی ہے اس نے ریلوے افسروں کو بلا بھیجا ریلوے کے ذمہ داروں نے گاندھی سے کہا کہ وہ پیچھے جا کر سامان والے ڈبے میں بیٹھیں۔ انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا" لیکن میرے پاس تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے " اس پر ریلوے کے لوگ بولے کہ" تمہیں سامان والے ڈبے میں جانا ہی ہوگا "

گاندھی نے پھر کہا کہ " میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر ڈربن سے بیٹھا ہوں اور میں نے طے کر لیا ہے کہ اسی میں بیٹھا رہوں گا ۔" ریلوے کے آدمی نے کہا " نہیں تم نہیں بیٹھے رہ سکتے " پھر اس نے دھمکی دی کہ اگر گاندھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹے گا تو پولیس بلائی جائے گی ۔

موہن داس گاندھی نے کہا " پولیس کو بلا لیجئے لیکن اپنی خوشی سے میں یہاں سے جانے سے انکار کرتا ہوں "

پولیس کا ایک سپاہی آیا اس نے گاندھی کو ڈبے سے باہر دھکیل دیا اور ان کا سامان بھی باہر پھینک دیا گاندھی نے سامان والے ڈبے میں جانے سے انکار کیا اور ٹرین ان کو چھوڑ کر روانہ ہو گئی وہ اپنا کچھ سامان کھینچ کر مسافر خانے میں لے آئے ۔لیکن سامان کا زیادہ حصہ پلیٹ فارم ہی پر پڑا رہا۔ اس درمیان ریلوے کے لوگ آئے اور انہوں نے سامان کا چارج لے لیا۔ گاندھی نے سوچا کہ بے عزتی کے ساتھ ساتھ آج رات بھر سردی بھی کھانی پڑے گی کیونکہ جاڑے کا زمانہ تھا اور ماٹزبرگ کا شہر کافی بلندی پر ہے ان کا اوور کوٹ باہر والے سامان میں تھا لیکن شیکی کے خیال سے انھوں نے اسے نہیں مانگا اس طرح رات بھر بیٹھے بیٹھے ٹھٹرتے رہے اور جو واقعہ ہوا تھا اس پر سوچتے رہے جس سے ان کے دل میں سماجی ناانصافی کے خلاف جذبہ بڑھتا گیا اور بیداری پیدا ہو گئی۔ اس رات ان کے دل میں جو خیالات آئے ان کے بارے میں انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس طرح لکھا ہے :

میں اپنے فرض کے بارے میں سوچنے لگا ... کیا میں اپنے حقوق کے لیے لڑوں یا ہندوستان واپس جاؤں؟ یا پھر بے عزتی کی پروا کیے بغیر پری ٹوریا جاؤں اور مقدمہ کی پیروی کرنے کے بعد ہندوستان لوٹ جاؤں ؟ اپنا کام پورا کیے بغیر وطن بھاگ جانا تو بزدلی ہو گی میں جس مصیبت میں مبتلا ہوا تھا وہ اصلی نہیں تھی بلکہ تعصب رنگ کے گہرے مرض کی ایک

ایک علامت تھی اگر ہوسکے تو مجھے مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اس سلسلے میں اگر مصیبت پڑے تو اسے جھیلنا چاہیئے رنگ کے امتیاز کو دُور کرنے کے لیے جس حد تک ضروری ہو اس حد تک مجھے ناانصافی کے خاتمے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد انہوں نے اگلی ٹرین سے پری ٹوریا جانے کا فیصلہ کیا۔ اسی کے ساتھ ریلوے لائن کے جنرل منیجر اور اپنے ضمانت دار کو تار بھیج دیا۔ ضمانت دار سیٹھ عبداللہ تار پاکر جنرل منیجر سے ملنے گئے اس افسر نے مارٹز برگ کے ریلوے ذمہ داروں کے برتاؤ کی حمایت کی لیکن کہا کہ اس نے اسٹیشن ماسٹر کو ہدایت کر دی ہے کہ اب کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے تاکہ گاندھی اطمینان سے پری ٹوریا پہونچ جائے عبداللہ سیٹھ نے اس کے علاوہ اور بھی کئی کام کئے۔ انہوں نے مارٹز برگ اور آس پاس کے دوستوں کو خط بھیج دیئے کہ وہ گاندھی کی دیکھ بھال کریں۔ ان کی بھی اسی طرح بے عزتی ہو چکی تھی انہیں گاندھی کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔

لیکن دوسرے دن کی شام تک گاندھی آگے سفر نہیں کر سکے۔ شام کو وہ ریزرو سیٹ پر بیٹھے۔ لیکن ان کی مصیبت ابھی ختم نہیں ہوئی اگلے دن صبح جب ٹرین چارلس ٹاؤن پہونچی تو ایجنٹ نے ان کے اسٹیج کوچ والے ٹکٹ کو جو چارلس ٹاؤن سے جوہانسبرگ کے لیے ملتا ہے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

اس نے گاندھی سے کہا۔ "آپ کا ٹکٹ خارج ہوگیا" یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ اس پر گاندھی نے اعتراض کیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستانی وکیل گاندھی کو ابھی تک "قلی" سمجھا جاتا تھا اور اندر کوچ میں گوروں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی آخر میں ان سے کہا گیا کہ کوچ بکس پر بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ اُن کے ساتھ بڑی زیادتی تھی لیکن گاندھی چپ چاپ باہر آکر بیٹھ گئے کیونکہ انہیں اپنی منزل پر پہونچنا تھا جب گاڑی پورڈ کوپر مقام پر پہونچی تو اس کے نگراں نے جو ایک گورا تھا اور عام طور پر کوچ بکس پر بیٹھتا تھا اپنی سیٹ واپس لینے کا ارادہ کیا تاکہ وہ وہاں بیٹھ کر سگریٹ پی سکے اور کھلی ہوا کا لطف لے سکے اس نے ایک میلا کپڑا فٹ بورڈ پر ڈال گاندھی سے کہا۔ "سامی اس پر بیٹھ جاؤ میں ڈرائیور کے پاس بیٹھنا چاہتا ہوں" معلوم ہونا چاہیے کہ لفظ 'سامی' قلی کے ہم معنی تھا۔

گاندھی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا "تم ہی نے تو مجھے یہاں بیٹھنے کو کہا تھا حالانکہ مجھے جگہ اندر ملنی چاہیے تھی لیکن میں نے یہ زیادتی چپ چاپ برداشت کر لی اور اب تم باہر بیٹھ کر سگریٹ پینا چاہتے ہو اور مجھے اپنے پیروں تلے بٹھانا چاہتے ہو میں یہ نہیں برداشت کر سکتا ہاں! اندر بیٹھ سکتا ہوں"

وہ آدمی اٹھا اور گاندھی کو برا بھلا کہنے لگا اور ان کے سر پر زور سے ڈنڈا مار دیا۔

ساتھ ہی ساتھ کوچ کے باہر پھینک دینے کی کوشش کی لیکن نوجوان کوچ کی سلاخیں پکڑ کر اپنی جگہ پر

ڈنار ہا آخر میں کچھ مسافروں نے گاندھی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور کہا کہ وہ ایسا نہ کرے اور گاندھی کو ہمارے ساتھ اندر بیٹھنے دے کوچ نگراں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دھمکی دی کہ اسٹینڈرٹن کے مقام پر پہنچ کر اور مزا چکھاؤں گا لیکن وہاں گاندھی کو ایک ہندوستانی دوست مل گئے اور انہوں نے اپنے ساتھ اسی قسم کی کی جانے والی زیادتیوں کا حال سنا کر تسلی دی اور گاندھی سے صبر کرنے کو کہا۔

لیکن گاندھی ان لوگوں میں نہیں تھے جو اپنا کام ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔ انہوں نے کوچ کمپنی کو سارا حال لکھا اور یہ یقین دہانی چاہی کہ اگلے دن جب میں آگے سفر کروں تو میرے ساتھ اس قسم کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ جیسا انتظام چاہتے ہیں ویسا ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا اور گاندھی اسی رات کو خیریت سے جوہانس برگ پہونچ گئے جو ایک بہت بڑا شہر ہے۔

جوہانس برگ میں ان سے ایک آدمی ملنے والا تھا اس کو وہاں نہ پاکر گاندھی نے اپنی سادہ لوحی سے شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں کمرہ لینا چاہا منیجر نے بتایا کہ ساری جگہ بھر گئی ہے اس لیے وہ ایک چھوٹی ٹیکسی پر ایک ہندوستانی دوست کی دکان پر گئے وہاں انہیں یہ پتہ چلا کہ ٹرانسوال میں تو ہندوستانیوں کو نیٹال سے بھی زیادہ بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہوٹل میں کمرے نہیں ملتے اور تیسرے درجے میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں ہندوستانیوں کو دوسرے درجے کے ٹکٹ نہیں دیئے جاتے تھے۔

گاندھی کو یہ سب منظور نہیں تھا انہوں نے ریلوے کے تمام قاعدے قانون پڑھ ڈالے اور ان کے اندر ہندوستانیوں کی بچت کے لیے راستہ نکال لیا انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے کہا کہ میں ایک بیرسٹر ہوں اور ہمیشہ پہلے درجے میں سفر کرتا ہوں۔ مجھے جلد ہی ایک فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کی ضرورت پڑے گی جسے میں آپ کے پاس آکر خود ہی لے جاؤں گا۔

ایک دن وہ فراک کوٹ پہنے ٹائی لگائے اسٹیشن پہنچے، اپنے کرائے کے پیسے کھڑکی پر رکھے اور پہلے درجے کا ٹکٹ مانگا ٹکٹ مل گیا۔

اسٹیشن ماسٹر ہالینڈ کا رہنے والا تھا نہ کہ ٹرانسوال کا گاندھی کو اس نے بتایا کہ میں افریقہ کا رہنے والا نہیں یورپ کا ہوں اور جس تکلیف کا انہیں احساس ہو رہا ہے اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن میں ٹکٹ ایک ہی شرط پر دے سکتا ہوں وہ یہ کہ اگر کوئی مسافر آپ سے پہلے درجے سے باہر جانے کو کہے تو آپ ریلوے کے خلاف مقدمہ دائر کرکے اس میں مجھے مت پھنسائیں۔ گاندھی نے اس کی یہ شرط مان لی۔

وہ پہلے درجے میں جاکر بیٹھ گئے۔ جب گارڈ ٹکٹ کی جانچ کرنے آیا تو اس نے گاندھی سے اشارہ کیا کہ وہ تیسرے درجے میں جاکر بیٹھیں نوجوان ہندوستانی وکیل نے اپنا پہلے درجے کا ٹکٹ دکھایا لیکن

گارڈ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

اس پر ایک انگریز مسافر گاندھی کی حمایت کرنے لگا اور گارڈ سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ ان کے ساتھ مجھے سفر کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ گارڈ یہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا کہ اگر "قلی" کے ساتھ انگریز کو بیٹھنا منظور ہے تو مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اسے ہٹاؤں۔ اس طرح پری ٹوریا کا یہ سفر خیریت سے پورا ہو گیا۔

لیکن گاندھی کی قسمت میں ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا لکھا تھا۔ یہ مصیبت تھی بھی عجیب قسم کی گاندھی جب پری ٹوریا پہنچے تو انھیں لینے کے لیے کوئی اسٹیشن پر نہیں آیا تھا۔ اسٹیشن پر ٹکٹ بابو شرافت سے پیش آیا۔ لیکن وہ یہ نہیں بتا سکا کہ گاندھی رات بھر کہاں ٹھہریں۔ ہوٹلوں میں جا کر اپنی بے عزتی کرانا مناسب نہ تھا۔

حسن اتفاق سے ایک امریکی نگرو گاندھی کی مدد کے لیے آگیا وہ انہیں ایک ہوٹل میں لے گیا جسے ایک دوسرا امریکی چلاتا تھا اس نے ہوٹل میں انھیں ایک کمرہ اس شرط سے دیا کہ وہ کھانا کمرے کے اندر ہی کھائیں گے۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا کہ اگر گاندھی کھانے کے ہال میں کھائیں تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے دوسرے لوگوں کو ضرور شکایت ہوگی کیونکہ وہ گورے یورپی ہیں۔ گاندھی اس کی بات سمجھ گئے انہیں اس دوران رنگ کے امتیاز کے بارے میں کافی واقفیت ہو چکی تھی۔

لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ انہیں اپنے کمرے میں نہیں کھانا پڑا ہوٹل کے مالک مسٹر جانسن نے دوسرے لوگوں سے پوچھا کہ ان کے ساتھ ایک ہندوستانی کے بٹھانے پر انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے گاندھی کو کھانے کے ہال میں بلا لیا گیا۔ اگلے دن سویرے وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے تیار ہو گئے جس کی خاطر وہ پری ٹوریا آئے تھے۔

٦۔ مقصد کی تلاش

گاندھی جس مقدمے کے سلسلے میں بلائے گئے تھے وہ چالیس ہزار پونڈ یعنی لگ بھگ آٹھ لاکھ روپئے کا تھا یہ بہت اُلجھا ہوا معاملہ تھا جس میں پیچیدہ بہی کھاتے اور بہت سے لین دین کے کاغذات تھے۔ ان کو اپنے سیٹھ کی طرف سے اٹارنی (وکیل) کے لیے سل تیار کرنی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر لین دین اچھی طرح سمجھا جائے اور تمام معاملات کو ترتیب کے ساتھ رکھا جائے۔ ہندوستان سے آنے والے نوجوان وکیل کو دونوں طرف کے اٹارنیوں کے کام کا ڈھنگ دیکھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

اس عرصے میں انہیں جو تجربات حاصل ہوئے ان سے وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ ایسے معاملات میں مقدمہ بازی بہت مہنگی ثابت ہوگی اس لیے دونوں فریق کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ پنچ فیصلہ کرا کے سمجھوتہ کرلیں۔ آخر کار دونوں فریق سمجھوتے پر راضی ہوگئے کیونکہ انہوں نے بھی محسوس کیا کہ مقدمہ بازی اتنی مہنگی پڑرہی ہے کہ اگر وہ جاری رہی تو فیصلے کے بعد کسی فریق کی جیت نہیں ہوگی دونوں گھاٹے میں رہیں گے۔

پنچ فیصلے کے مطابق گاندھی جی کے مؤکل سیٹھ عبداللہ جیت گئے۔ سیٹھ نے بھی سمجھوتے کا لحاظ کرتے ہوئے فریق مخالف سے ساری رقم ایک ساتھ لینے کے بجائے چھوٹی چھوٹی قسطوں میں لینا منظور کرلیا۔ اس کے بارے میں گاندھی جی نے بعد کو لکھا:

"میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی میں نے قانون کا صحیح استعمال سیکھ لیا تھا انسانی ذہنیت کو ٹھیک ڈھنگ سے سمجھنا اور لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کرنا مجھے آگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وکیل کا اصلی کام یہ ہے کہ جن دو فریقوں کے دلوں میں میل پیدا ہوگیا ہو اسے دور کرکے میل کرادے"

گاندھی جی نے بیس سال تک وکالت کی اور افریقہ میں انہوں نے جو سیکھا تھا اسی کے مطابق انہوں نے اپنا بہت سا وقت سیکڑوں معاملوں میں نجی سمجھوتے کرانے میں صرف کردیا اس سے انہیں بہت سکون حاصل ہوتا تھا ان کے ذہن میں کامیابی کا یہی تصور تھا۔

اس طرح کام کرنے سے وہ نئے نئے دوست بناتے گئے ان دوستوں میں کچھ تو جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانی تھے اور کچھ انگریز عیسائی تھے جو مشنری کی حیثیت سے وہاں رہتے تھے۔ عیسائیوں اور ہندوستانی مسلمانوں نے کوشش کی کہ گاندھی جی ہندو مذہب چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار کرلیں۔

گاندھی جی کی ان لوگوں سے خوب بحثیں ہوتی تھی اس کی وجہ سے وہ اپنے مذہب کے بارے میں

گہرائی سے سوچنے لگے انہوں نے مذہب اور فلسفے کے متعلق بڑی مستعدی سے معلومات حاصل کیں ۔ انہوں نے کچھ کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کا ان پر بہت اثر پڑا تھا ۔ ان میں سے ایک ٹالسٹائی کی کتاب تھی " خدا کی حکومت تمہارے اندر ہے "، ان کا کہنا ہے کہ اس کتاب نے ان پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ وہ بالکل مسحور ہو گئے۔

گاندھی جی نے اپنا مذہب کبھی نہیں بدلا لیکن اپنے عیسائی دوستوں کا احسان ظاہر کرنے میں کبھی کوئی کمی نہیں کی ان کا کہنا تھا کہ ان دوستوں نے میرے اندر مذہبی کھوج کا جذبہ پیدا کیا۔

ایک دن ان سے کسی نے پوچھا " بائبل میں کون ایسی خاص بات ہے جو ہماری مذہبی کتابوں میں نہیں ہے ؟" یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سوال کرنے والا ایک ہندو بھائی تھا ۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں ہر مرد اور عورت کا فرض سمجھتا ہوں کہ وہ دنیا کی مذہبی کتابوں کو ہمدردی اور عقیدت کے ساتھ پڑھے ۔

آگے چل کر انہوں نے کہا " اگر ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے مذہب کا اسی طرح احترام کریں جس طرح ہم اپنے مذہب کا کرتے ہیں تو دنیا کے مذہبوں کا مطالعہ کرنا ہمارا فرض ہو جاتا ہے ہمارے گھروں کے اچھی عمر کے لڑکے اگر دوسرے مذہبوں کی کتابوں کو پڑھنے اور متاثر ہوتے ہیں تو اس سے ہمیں ڈرنا نہیں چاہئیے اگر ہم انہیں آزادی کے ساتھ وہ سب کچھ پڑھنے دیتے ہیں جو سچ اور صاف ہے تو ہم اس طرح زندگی کے متعلق ان کے نقطہ نظر کو بلند اور صالح بناتے ہیں "

انہوں نے یہ بھی کہا کہ ڈر کی بات تو اس وقت ہو گی جب کوئی جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے صرف اپنے ہی مذہب کی کتابیں پڑھ کر سنائے اور چھپا کر یا کھلم کھلا ان کا مذہب بدلنے کی کوشش کرے ایسا کرنا اپنے مذہب کی جانب داری ہو گی " جہاں تک میرا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ بائبل، قرآن شریف اور دوسری مذہبی کتابوں کا میرا مطالعہ اور ان کا احترام میرے ہندو ہونے کے دعوے کے بالکل مطابق ہے ... دوسرے مذہبوں کی کتابیں پڑھنے سے ہندو مذہب کے ساتھ میری عقیدت اور احترام میں کوئی کمی نہیں آئی ہے .... بلکہ انہوں نے میرے نقطہ نظر میں وسعت پیدا کی ہے ۔ ان کے پڑھنے سے ہندو مذہب کے بہت سے وہ حصے جو واضح نہیں تھے انہیں زیادہ اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملی ہے "

مقدمہ ختم ہونے کے بعد گاندھی جی ڈربن واپس آئے وہ یہاں آکر ہندوستان جانے کے بارے میں سوچنے لگے جس دن ان کی الوداعی دعوت ہونے والی تھی اس سے ایک دن پہلے وہ عبداللہ سیٹھ کے مکان پر بیٹھے اخبارات دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر ایک خبر پر پڑی ۔ جس کی سرخی تھی ' ہندوستانی حق رائے دہی' اس نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ۔

یہ خبر ایک قانون کے بارے میں تھی جو مجلس قانون ساز کے سامنے تھا اور جس کا مقصد نیٹالی مجلس

قانون ساز کے لیے ہندوستانیوں کو ممبر بننے کے حق سے محروم کر دینا تھا۔ یہ سراسر ناانصافی تھی اس خبر کو پڑھ کر گاندھی جی کو بڑا دکھ ہوا اور انہوں نے فوراً اس مسئلے پر اپنے دوستوں سے بات چیت کی یہ بالکل ظاہر بات تھی کہ اگر یہ قانون منظور ہو جاتا ہے تو جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کی مصیبت اور بڑھ جائے گی اور آئندہ ان پر اس سے زیادہ سخت پابندیاں لگائی جائیں گی۔

گاندھی جی سے لوگوں نے کہا کہ اس بل کے خلاف کام کرنے کے لئے آپ ایک مہینہ اور رک جائیے سیاست میں گاندھی جی کا یہ پہلا قدم تھا یہ قدم تھا تو چھوٹا موٹا لیکن پیش خیمہ تھا ایسی سرگرمیوں کا جو زبردست سیاسی اہمیت رکھنے والی تھیں۔

جب بل کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ گاندھی جی کی خدمات کا معاوضہ دیا جانا چاہیے۔

گاندھی جی نے کہا کہ "عوامی کام کے لیے کوئی تنخواہ یا فیس نہیں لی جا سکتی" ان کا کہنا تھا کہ صرف ایسے اخراجات جیسے تار، قانونی کتابیں اور پمفلٹ وغیرہ کی چھپائی کے لیے پیسے دے دیئے جایا کریں۔
انہوں نے دیر لگائے بغیر اپنے کام کا منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے مجلس قانون ساز میں پیش ہونے والے بل میں ان جملوں کے اضافے کی تجویز رکھی ـــ ہندوستانی تاجروں اور ان لوگوں کے خلاف جو ہندوستان سے آکر یہاں بسنا چاہتے ہیں نامناسب پابندیاں ہٹائی جائیں۔

نیٹال کی ہندوستانی آبادی نے گاندھی جی کی رہنمائی کا خیر مقدم کیا برطانی کابینہ کے ممبر اور وزیر نوآبادیات، لارڈ رپن کو بھیجی جانے والی عرضداشت پر نیٹال میں رہنے والے ہندوستانیوں کے دس ہزار دستخط کرائے گئے اور درخواست کی گئی کہ حکومت ہندوستانیوں کے حق رائے دہی کو تسلیم کرے۔

اس تحریک کی شہرت ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ ہو گئی اور وہاں کے بڑے اخباروں نے نیٹال میں رہنے والے ہندوستانیوں کی حمایت کی۔ اس درمیان ایک مہینہ پورا ہو گیا لیکن گاندھی جی اس تحریک میں پوری طرح جٹ گئے تھے اس لیے انہوں نے نیٹال میں بس جانے کا فیصلہ کیا اور اپنی گذر بسر کے لیے اس فیس کو بنیاد بنایا جو انھیں ہندوستانی تاجروں سے قانونی امداد کے عوض میں ملتی تھی۔ انہوں نے سپریم کورٹ میں وکالت کے لیے درخواست بھیجی لیکن رنگ کے امتیاز کی بنا پر ان کی مخالفت کی گئی حالانکہ انہوں نے پوری طرح قانونی خانہ پوری کر دی تھی صرف ایک سرٹیفکٹ وہ نہ لگا سکے تھے۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح ان کی درخواست منظور کر لی گئی۔ لیکن سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے ایک بات اٹھائی جس سے گاندھی جی اچھی طرح واقف تھے ـــ اور وہ پگڑی کا معاملہ تھا۔ ان سے کہا گیا کہ ضلع عدالت

کی طرح یہاں بھی پگڑی اتارنی ہوگی اس بار گاندھی جی نے ان کی بات مان لی کیونکہ انہیں جنوبی افریقہ میں اس سے کہیں زیادہ اہم مورچوں پر لڑنا تھا۔

اب گاندھی جی عوامی کاموں میں خاص دلچسپی لینے لگے۔ ان کاموں کو اچھی طرح چلانے کیلئے انھوں نے ایک جماعت بنائی اس کا نام ''نیٹال انڈین کانگرس'' رکھا جس کے سکریٹری وہ خود تھے۔ اس جماعت کا کام تھا کہ وہ افریقہ کے دوسرے حصوں میں نیز ہندوستان اور انگلستان میں پروپیگنڈہ کرے تاکہ وہاں کے لوگوں کو نیٹال میں رہنے والے ہندوستانیوں کی حالت کا علم ہوتا رہے۔ اس کے علاوہ اس جماعت نے مختلف کاموں میں لگے سب ہندوستانیوں کو یکجا کرنے اور ایک دوسرے سے ملنے کا موقع بھی فراہم کیا۔

ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ گاندھی جی نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ ٹالسٹائی کی اور کتابیں پڑھیں، واشنگٹن اِروِن کی کتاب ''لائف آف محمدؐ اینڈ ہز سکسرس (محمدؐ کی زندگی اور ان کے خلیفہ'' اور ٹامس کارلائل کی لکھی ہوئی محمدؐ کے متعلق کتاب بھی پڑھی اسی طرح ہندو مذہب کے بارے میں بھی بہت سی کتابیں پڑھیں سچی بات یہ ہے کہ گاندھی اپنے عقیدے میں پکے تھے اور مختلف مذہبوں کی کتابوں کا مطالعہ ان میں اور پختگی پیدا کررہا تھا۔

ایک دن نیٹال انڈین کانگرس کے کچھ دوستوں کے ساتھ وہ ڈربن کے آس پاس کے علاقے میں گھوم رہے تھے ہندوستانی بستی کے پاس انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ پیڑ کے پیچھے چھپے ہیں۔ ان کے ساتھیوں نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے گاندھی جی کو بتایا کہ یہ جھینپ محسوس کرنے والے مصیبت زدہ لوگ کوڑھ کا شکار ہیں اسی لیے یہ دوسرے لوگوں سے الگ رکھے جاتے ہیں۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کسی نے لکھا ہے کہ گاندھی جی منع کرنے کے باوجود اپنے حیرت زدہ اور پریشان ساتھیوں کو چھوڑ کر اکیلے ہی اطمینان کے ساتھ آگے بڑھے اور اُن شرمائے ہوئے کوڑھیوں کے پاس پہونچ گئے اور جلد ہی ان سے گھل مل کر باتیں کرنے لگے گاندھی جی نے اپنی زندگی میں اس قسم کے اور بہت سے جو کام کئے ان میں یہ پہلا کام تھا۔ آگے چل کر کئی سال بعد ہندوستان میں انہوں نے اپنے آشرم میں بہت سے لوگوں کی رائے کے خلاف ایک کوڑھی کو جگہ دی۔ انہوں نے اپنے عبادتی جلسے میں بتایا کہ ایک پوری رات میں نے اس معاملے پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ معاملہ میرے عقیدے کے لئے ایک چیلنج کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کوڑھی مشہور دانشور ڈاکٹر پرچورے شاستری تھے وہ آشرم واسیوں میں شامل کرلیے گئے۔ گاندھی جی خود اپنے ہاتھ سے ان کے زخموں کی مرہم پٹی کرتے تھے شاستری جی کئی سال تک آشرم میں رہے۔ گاندھی جی اکثر ہندوستان میں کوڑھیوں کی حالت درست کرنے کے لیے کام کرتے رہتے تھے وہ اس بیماری کی صحیح واقفیت پر زور دیا

کرتے کوڑھیوں کی دیکھ بھال کا بندوبست کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس کام کو اپنے تعمیری پروگرام کا ایک جز بنا لیا تھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ کوڑھ کا مرض چھوت کا مرض نہیں ہے۔ اس لیے کوڑھیوں کو الگ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ کوڑھ کوئی جرم نہیں ہے اور نہ کوڑھی سماج کے مجرم جنہیں بچایا نہ جائے۔

اپنی اصول پرستی کو سنجیدگی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں گاندھی جی کو کافی شخصی قربانی کرکے افریقہ میں رہنا پڑا۔ یہاں ان کے تین سال نکل گئے۔ ان کا خاندان ہندوستان میں تھا۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے طے کیا کہ انہیں ہندوستان جاکر کستور بائی اور بچوں سے ملنا چاہیے اور انہیں اپنے ساتھ جنوبی افریقہ لانا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی خیال کیا کہ اس طرح ہندوستان میں نیٹال کانگرس کے کاموں کے لیے چندہ جمع کرنے کا بھی موقع مل جائے گا۔ جنوبی افریقہ سے پانی کے جہاز سے روانہ ہوکر وہ چوبیس دن میں کلکتے پہنچے۔ راستے میں انہوں نے اردو اور تامل زبان سیکھنے کی کوشش کی۔ جنہیں وہ پہلے اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔

ہندوستان آنے کے فوراً بعد انہوں نے جنوبی افریقہ کے بارے میں لکچر دینے اور مضمون لکھنے شروع کر دیے۔ جس سے وہاں کے متعلق ہندوستان کے لوگوں کو علم ہوا اور انہیں وہاں کی حالت معلوم ہوئی۔ آگے چل کر ان میں سے ایک مضمون جو پمفلٹ کی شکل میں بھی چھپ گیا تھا ان کو پریشانی میں ڈالنے کا باعث بنا۔

دسمبر کے مہینے میں جب وہ جہاز سے افریقہ کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ کستور بائی، ان کے اپنے دو بیٹے اور بیوہ بہن گوکی کا ایک لڑکا تھا وہ سب کورینڈ نامی جہاز سے سفر کر رہے تھے ڈربن کے لیے اسی وقت ایک اور جہاز جس کا نام 'نادیری' تھا روانہ ہوا جنوبی افریقہ پہنچنے پر ان دونوں جہازوں کا سفر خاص اہمیت رکھنے والا ثابت ہوا

۷۔ گاندھی کو موت کے گھاٹ اتار دو

دونوں جہاز ایک زبردست طوفان کا سامنا کرنے کے بعد ۱۸ر دسمبر کو ڈربن بندرگاہ پر پہنچ گئے گاندھی جی کو سمندر کی بیماری کبھی نہیں ہوئی اس لیے سفر کے دوران جن مسافروں کو یہ شکایت ہو جاتی وہ ان کی تیمارداری کرتے اور انہیں تسلی دیتے۔ دونوں جہازوں پر کل آٹھ سو مسافر تھے۔

سمندری طوفان کے بعد خشکی پر گاندھی جی کو جس طوفان کا سامنا کرنا پڑا وہ اس سے زیادہ خوفناک تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جہاز کے مسافروں کو بغیر پوری ڈاکٹری جانچ کے نہیں اترنے دیا

جاتا تھا۔ ہندوستان سے آنے والے دونوں جہازوں کی اچھی طرح جانچ کی گئی کیونکہ جب بمبئی سے چلے تھے تو وہاں طاعون پھیلا ہوا تھا۔

یہ ٹھیک بات تھی کہ سب مسافروں کو پانچ دن تک کورن ٹین میں رکھا گیا لیکن گاندھی جی کو شک ہوا کہ گوری حکومت کا منصوبہ کچھ اور ہی ہے یہ شک بعد کو بالکل صحیح ثابت ہوا کیونکہ معلوم ہوا کہ گورے لوگ سمندر کے ساحل پر جلسے کر رہے ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ دونوں جہاز مسافروں کو اتارے بغیر واپس کر دئے جائیں کورن ٹین کا اصلی مقصد یہی تھا۔ حد یہ ہے کہ یہ دھمکی بھی دی گئی کہ ہندوستانی مسافروں کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔

گاندھی جی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس منصوبے کا خاص نشانہ وہ خود ہی تھے۔ ان پر یہ الزامات لگائے گئے کہ وہ ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ میں اس لیے لا رہے ہیں تاکہ ان کی طاقت اور تعداد میں اضافہ ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ جب ہندوستان میں تھے تو انہوں نے نیٹال کے گوروں پر غلط الزامات لگائے۔ یہ دونوں شکایتیں جھوٹی تھیں کیونکہ اپنے خاندان والوں کے سوا انہوں نے کسی کو جنوبی افریقہ جانے کے لیے آمادہ نہیں کیا حقیقت یہ ہے کہ جہاز میں بیٹھنے سے پہلے وہ کسی مسافر کو جانتے تک نہ تھے جہاں تک غلط الزام لگانے کا تعلق ہے تو انہوں نے ہندوستان جا کر نیٹال کے گوروں کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہی جو وہ نیٹال میں نہ کہہ چکے ہوں۔

آخر کار دونوں جہازوں کو بندرگاہ میں آنے اور مسافروں کو اترنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن گاندھی خاندان کے لوگوں سے کہا گیا کہ وہ شام تک ٹھہرے رہیں کیونکہ گورے خاص طور پر گاندھی کے مخالف تھے۔ اس پر جہاز راں کمپنی کے قانونی مشیر نے کہا کہ گاندھی خاندان کو تو میں ابھی اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ شریمتی گاندھی اور بچے پہلے نکلے اور اطمینان کے ساتھ گھر لائے گئے۔ گاندھی اور قانونی ایجنٹ نے ساتھ ساتھ پیدل جانا طے کیا لیکن گورے لوگوں نے گاندھی کو جلد ہی پہچان لیا اور بھیڑ جمع ہونے لگی تب انہوں نے رکشا کیا لیکن لوگوں کی چیخ پکار اور دھکم دھکا سے وہ رکشے میں بیٹھ نہ سکے بھیڑ اتنی بڑھ گئی کہ ریل پیل میں دونوں الگ الگ ہو گئے تب گاندھی جی پر پتھر، ڈھیلے اور سڑے انڈے پھینکے جانے لگے ان کی پگڑی سر سے اتار لی گئی اور لات گھونسوں کی بوچھار ہونے لگی۔

اتفاق سے کپتان پولیس کی بیوی ادھر سے گذری اور اس نے ان کو بچا لیا اس کے کہنے پر پولیس نے ان کے چاروں طرف گھیرا بنا لیا اور پھر قیام گاہ پر بغیر نقصان پہنچے لے گئی۔ گاندھی کے

خلاف نعرے لگاتے ہوئے گورے غنڈے گلیوں اور سڑکوں پر جمع ہونے لگے انہوں نے اس مکان کو گھیر لیا جس میں گاندھی خاندان ٹھہرا ہوا تھا۔ ان سب واقعات کے بعد گاندھی کو اپنی پالیسی بدلنا پڑی۔ اس سے پہلے انہوں نے کہا تھا کہ کھلّم کھلا خطرے کا سامنا کریں گے۔ اس لیے انہیں مار کھانی پڑی خیریت یہ ہوئی کہ کوئی سخت چوٹ نہیں آئی۔ اب انہیں مشورہ دیا گیا کہ وہ بھیس بدل کر گھر سے باہر چلے جائیں ورنہ خطرہ ہے کہ گھر ہی کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے کہ انہوں نے اس وقت بھیس بدل کر باہر جانے کا فیصلہ کیوں کیا؟ آیا اپنے دوست کے مکان کو بچانے کے لیے کیا یا اپنے خاندان اور اپنے کو خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا؟ انہوں نے ایک ہندوستانی سپاہی کی وردی پہنی اور ایک پلیٹ رومال سے سر پر باندھ لی تاکہ وہ لوہے کا ٹوپ معلوم ہو ہندوستانی لباس میں دو خفیہ ان کے ساتھ ہو لیے۔

اس طرح وہ مکان سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اندر جب یہ سب ہو رہا تھا باہر پولیس کپتان نے بھیڑ کا دھیان بٹائے رکھا اور وہ خود ایک گیت سب کے ساتھ گانے لگا جس کا مطلب تھا "گاندھی کو موت کے گھاٹ اتار دو" جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ گاندھی چلا گیا ہے۔ تب اس نے مجمع سے کہا کہ ہندوستانی وکیل تو غائب ہو گیا۔ مکان کی تلاشی لی گئی تو واقعی وہ مکان میں نہیں ملا اس کے بعد بھیڑ تتر بتر ہو گئی۔

برطانی حکومت کے ذمہ داروں نے گاندھی جی سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو ان لوگوں پر مقدمہ چلا سکتے ہیں جنہوں نے آپ پر حملہ کیا ہے لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

انہوں نے کہا کہ میں کسی پر مقدمہ چلانا یا اس کے خلاف استغاثہ دائر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے مارنے والوں کو میرے بارے میں غلط باتیں بتائی گئی تھیں مجھے یقین ہے کہ جب انہیں سچ بات معلوم ہو گی تو وہ خود افسوس ظاہر کریں گے۔

اور ہوا بھی ایسا ہی کچھ دنوں بعد نیٹال کے انگریزی روزنامہ اخبار ایڈورٹائزر کا نمائندہ جب گاندھی جی سے ملا تو انہیں صورت حال کی وضاحت کا موقع ملا اخبارات نے گاندھی جی کی حمایت کی اور ڈربن کے یورپیوں نے ہونے واقعات پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ اس چیز نے جہاں ایک طرف شہر کے ہندوستانیوں کا وقار بڑھا دیا تو دوسری طرف مخالفوں کو اور زیادہ دشمن بنا دیا کیونکہ انہیں یہ بات بری لگی کہ ہندوستانیوں نے ان کا مقابلہ کر کے دکھا دیا اگرچہ طاقت کا استعمال نہیں کیا۔

گاندھی جی نے نیٹال انڈین کانگرس والا اپنا کام پھر شروع کر دیا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کچھ مستقل قسم کا بھلائی والا کام بھی کیا جائے چنانچہ وہ ایک چھوٹے سے خیراتی مشن اسپتال میں روز صبح دو گھنٹے نرس کا کام کرنے لگے نرسنگ کے کام کا تجربہ آگے چل کر بوآر جنگ میں ان کے لیے بہت کارگر ثابت ہوا۔ اسی درمیان ان کا یہ خیال زیادہ پختہ ہو گیا کہ ان کی زندگی سادہ ہونا چاہئیے۔ اس لیے وہ اپنے زیادہ تر کام خود کرنے لگے اور دوسروں سے مدد لینا کم کرتے گئے کھانا پکانا تو وہ جانتے ہی تھے اس میں انہوں نے دو چیزیں اور شامل کر لیں — اپنے کپڑے دھونا اور بال کاٹنا۔

۱۸۹۹ء میں انگریزی حکومت اور جنوبی افریقہ میں بسنے والے ڈچ لوگوں کے درمیان بوآر جنگ چھڑ گئی اس میں گاندھی جی نے انگریزوں کی حمایت کی اگرچہ ان کی ذاتی ہمدردی بوار (جیسا کہ ڈچ لوگ کہلاتے تھے) لوگوں کے ساتھ تھی۔ انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ برطانی رعایا ہونے کی بنا پر وہ یہ مانتے تھے کہ ان کا فرض حکومت کی مدد کرنا ہے ابھی وہ اپنی اہنسا کے پوری طرح پابند نہ ہو پائے تھے۔

گاندھی جی نے وہاں رہنے والے ہندوستانیوں کی جانب سے بھی مدد کی۔ یقین دہانی کی۔ یہ بات انہوں نے وہاں کے ہندوستانیوں کے مشورے سے کی۔ شروع میں یہ مدد ٹھکرا دی گئی لیکن جب لڑائی میں انگریزوں کی حالت خستہ ہونے لگی تو جنوبی افریقہ کے افسروں نے یہ مدد قبول کر لی۔ اور ہندوستانی سیوا دل بنایا گیا۔ اس میں ۱۱۰۰ آدمی تھے اور اس دل کے غیر سرکاری لیڈر موہن داس گاندھی تھے۔ ان لوگوں نے چھ مہینے تک بہت مفید خدمت انجام دی جس کی ان لوگوں نے بھی تعریف کی جنہوں نے ۱۸۹۷ء کے ڈربن مظاہرے میں ہندوستانی باشندوں کی مخالفت کی تھی۔ گاندھی جی کو ایک جنگی تمغہ (وار مڈل) دیا گیا۔ یہ پہلا تمغہ تھا جو کسی ہندوستانی کو وہاں دیا گیا۔

۱۹۰۱ء میں لڑائی ختم ہونے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں رہنے والے دوستوں کا جو اُن کے ملک میں واپس آنے کی درخواست کر رہے ہیں لحاظ کیا جانا چاہئیے۔ انہوں نے بہر حال یہ کہا کہ اگر ایک سال کے اندر ان کی ضرورت پڑی تو وہ افریقہ واپس آجائیں گے۔ رخصت ہوتے وقت گاندھی خاندان کو سونے، چاندی اور ہیرے کی قیمتی چیزیں تحفے میں دی گئیں لیکن بیوی اور بچوں کی رضامندی سے انہوں نے سب چیزیں واپس کر دیں اور یہ تجویز پیش کی کہ اس سارے سامان کو ہندوستانی باشندوں کی مدد کے لیے ایک ٹرسٹ کے سپرد کر دیا جائے۔ زیور اور دوسرے قیمتی تحفے قبول کرنا اس شخص کے لیے نامناسب تھا جس کا عقیدہ زندگی روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں حصہ لینے کے لیے گاندھی جی مع اپنے خاندان کے افریقہ

سے ہندوستان کے لیے چلے ان کا ارادہ برما جانے اور وہاں کے مختلف حصوں میں گھومنے کا تھا وہاں جاکر انہیں اپنے ہم وطنوں کی مصیبت اور غریبی کا وہ احساس ہوا جیسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا وہاں کی سیاسی بدعنوانی سے انہیں بڑا دھچکا لگا اور جس بری حالت میں ان لوگوں کو رہنا پڑتا تھا اسے دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گئے۔

۸۔ ایک نئی مصیبت

ہندوستان میں گاندھی جی کچھ ہی دن رہ پائے تھے کہ جنوبی افریقہ میں ایک نئی پریشانی پیدا ہو گئی۔ ہندوستان میں قیام کے دوران گاندھی جی کو یہ دیکھنے کا موقع مل گیا کہ یہاں کانگرس تنظیم کس ڈھنگ سے کام کر رہی ہے اور یہاں کے لوگوں کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان پر گوپال کرشن گوکھلے کا خاص طور پر اثر پڑا جو اس وقت یہاں کے مشہور سیاسی لیڈر اور بھارت سیوک سماج جماعت کے صدر تھے جس کو انہوں نے خود قائم کیا تھا اس کے ممبروں کی زندگی ہندوستان کی خدمت کے لیے وقف تھی اور ان کے گذر بسر کی ذمہ داری سماج پر تھی یہ جماعت اب بھی کام کر رہی ہے اور ایک اہم سماجی طاقت ہے۔

گاندھی جی نے کلکتے میں گوکھلے کے گھر پر ایک مہینے قیام کیا تھا۔ وہاں کے قیام سے انہیں بنگالیوں کی زندگی کے متعلق واقفیت ہو گئی تھی۔ گاندھی جی گوکھلے کو اپنا سیاسی گرو مانتے تھے وہ ان کے کہنے پر بمبئی میں پھر سے وکالت شروع کرنے پر راضی ہو گئے مگر وہ خود اس کے خواہش مند نہیں تھے کیونکہ انہیں بمبئی کی اپنی دکھ بھری زندگی کی یاد ابھی تازہ تھی بہر حال وہ تیار ہو گئے اور انہوں نے بمبئی میں ایک دفتر کھول دیا وہ جم کر بیٹھنے والے ہی تھے کہ جنوبی افریقہ سے تار آیا کہ آپ کی یہاں ضرورت ہے اور آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ ضرورت یہ تھی کہ نوآبادیات کے وزیر جوزف چیمبرلین جنوبی افریقہ آنے والے تھے وہاں کے ہندوستانی باشندوں نے طے کیا کہ ایک نمائندہ وفد ان سے ملے جو پوری صورت حال ان کے سامنے رکھے لیکن گاندھی کے بغیر کسی وفد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے انہیں بلایا گیا۔

گاندھی جی جنوبی افریقہ ٹھیک اس وقت پہونچے جب صرف انہیں میمورنڈم لکھنے کا موقع مل سکا۔ اس کے بعد وہ نیٹال سے وفد میں شامل ہو گئے برطانی ذمہ دار نے یہ تو تسلیم کیا کہ نیٹال میں رہنے والے ہندوستانیوں کی شکائتیں جائز ہیں لیکن انہوں نے کہا کہ وہ ان کے دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے مجبور ہو کر ہندوستانی لیڈروں نے ایک دوسرا بیان تیار کیا جو ٹرانسوال پہنچنے پر چیمبرلین کو پیش کیا جانے

والا تھا لیکن مقامی افسروں نے دوسرے وفد کے سلسلے میں جان بوجھ کر ٹال مٹول کی اور ان کے ساتھ برا برتاؤ بھی کیا تاکہ وہ چیمبرلین سے ملنے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کو وفد کی رہنمائی کرنے سے روک دیا گیا لیکن وفد کے باقی ممبر کسی نہ کسی طرح چیمبرلین کے پاس پہنچ ہی گئے۔

گاندھی جی نے اب جوہانس برگ میں وکالت کرنے کا فیصلہ کیا انہیں اس بات پر تھوڑا تعجب ہوا کہ ٹرانسوال کی سپریم کورٹ نے اجازت دے دی۔ اپنے لباس کے بارے میں اس بار انہوں نے کوئی درخواست نہیں کی۔ ابھی تک جو رائج لباس تھا وہی وہ پہنتے تھے۔ کالی ٹوپی، لمبے اونچے کالر کی بٹن دار جیکٹ اور ٹائی۔ اور اس وقت تک ان کے مونچھیں بھی تھیں۔

وہ لباس کو تو نہیں لیکن اپنے رہن سہن کو سہل اور سادہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے وہ ہر چیز پر اپنے مذہبی نقطۂ نظر سے غور کرتے تھے خدا پر ان کا عقیدہ روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بیماروں کے لیے وہ قدرتی علاج کا تجربہ کرنے لگے اور پہلے کے مقابلے میں اب دوائیوں کا سہارا لینا کم کر دیا۔

اپنی زندگی کے اس دور کے بارے میں انہوں نے بعد کو لکھا "مجھے یقین ہے کہ آدمی کو اپنے اندر دوائیں ٹھونسنے کی ضرورت بہت کم ہے ہزار میں نو سو ننانوے معاملے مناسب خوراک پانی اور مٹی کے استعمال اور اسی طرح کے گھریلو علاج سے درست کیے جا سکتے ہیں۔

صحت کے متعلق تجربے شروع کرنے کے کچھ سال بعد کستور بائی سخت بیمار پڑ گئیں۔ تین مہینے تک کمزوری کی شکایت رہنے کے باعث ڈربن میں ان کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر نے گاندھی جی کو ٹیلی فون کیا اور وہ جوہانس برگ سے فوراً ٹرین کے ذریعہ ڈربن آئے انہیں باکی بڑی فکر تھی انہوں نے دیکھا کہ وہ بالکل دُبلی ہو گئی ہیں۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے کستور بائی کو گائے کے گوشت کی یخنی دے دی ہے تو انہیں بڑی تکلیف ہوئی کیونکہ وہ پکے سبزی خور تھے۔ فونکس میں انہوں نے جو بستی بسائی تھی وہیں وہ رم جھم بارش میں کستور بائی کو لے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا بھی کہ میں کوئی ذمہ داری ایسی حالت میں نہیں لے سکتا لیکن گاندھی جی نے ذرا بھی پروا نہیں کی وہ جانتے تھے کہ انہوں نے کتنی بڑی بازی لگائی ہے۔

کستور بائی کا انہوں نے خود علاج کیا۔ ان کی آنتوں سے خون آنے لگا انہوں نے با سے درخواست کی کہ وہ نمک اور دال کا کھانا چھوڑ دیں لیکن کستور با کو ان کے علاج پر زیادہ عقیدہ نہیں تھا انہوں نے چیلنج کے طور پر کہا کہ یہ چیزیں آپ تو چھوڑ کر دیکھیے۔

گاندھی جی نے کہا " تم غلطی کر رہی ہو۔ اگر میں بیمار ہوتا اور ڈاکٹر مجھے یہ چیزیں یا اور دوسری چیزیں چھوڑنے کو کہتا تو میں بلا جھجک چھوڑ دیتا۔ خیر کوئی ڈاکٹر کہے یا نہ کہے اور چاہے تو چھوڑے یا نہ چھوڑے میں نمک اور دال ایک سال کے لیے چھوڑے دیتا ہوں "

یہ سُن کر کستور با کا دل مسوسنے لگا انہوں نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ ایسا عہد نہ کریں لیکن سنجیدگی سے کیے گئے عہد کو موہن داس کب چھوڑنے والے تھے۔ انہوں نے کہا " یہ میرے لیے ایک کسوٹی ہو جائے گی اور تمہارے لیے اپنے فیصلے کو پورا کرنے کے لیے ایک اخلاقی سہارا مل جائے گا "۔ اس کے بعد دس سال تک موہن داس نے نمک نہیں چھوا۔

کستور بائی اچھی ہونے لگیں۔ موہن داس برابر ان کے پاس رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کو موسمی کا رس دیتے تھے اس کے علاوہ انہیں نہ کوئی چیز کھانے دی اور نہ پینے کو پھر انہوں نے رفتہ رفتہ اور دوسری چیزیں دینی شروع کیں ۔ پھل، دودھ، بغیر مسالے کی سبزی اور آخر میں اناج آہستہ آہستہ کستور بائی تندرست ہونے لگیں پھر انہیں بخار وغیرہ کی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ان دنوں یہ علاج معجزہ جیسا سمجھا گیا کیونکہ ہنٹھی پیلیا مرض جان لیوا مانا جاتا تھا۔ کستور بائی کے ڈاکٹر تو مایوس ہو گئے تھے لیکن گاندھی جی نے انہیں تندرست کر دیا۔

انہوں نے سیدھے سادے ڈھنگ سے علاج کیا اور کامیاب ہوئے ان کا خیال تھا کہ خدا ان کا اور ان کے خاندان کا رکھوالا ہے اسی لیے انہوں نے دس کی زندگی بیمہ پالیسی ختم کر دی انہیں روپیہ جمع کرنے کی کوئی فکر نہیں تھی وہ اپنا کام دوسروں پر چھوڑنا برا سمجھنے لگے اور اپنا کام خود کرنے لگے۔ اس طرح ان پر کام کا بار کافی بڑھ گیا۔ انہیں جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کا ہر وقت خیال رہتا اور وہ کوشش کرتے کہ بنیادی حقوق حاصل کرنے کی لڑائی میں ان کی برابر مدد کرتے رہیں اور جو حقوق حاصل ہو چکے ہیں ان کی حفاظت کریں اسی مقصد کے لیے انہوں نے ایک ہفتے وار اخبار " انڈین اُپی نین " نکالا۔ اس اخبار نے حقوق کی لڑائی میں ایک طاقتور ہتھیار کا کام دیا۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی میں اس قسم کے جو اخبار نکالے ان میں یہ پہلا اخبار تھا۔

انہی دنوں ایک دوست نے انھیں ایک کتاب پڑھنے کو دی کتاب کا نام تھا " ان ٹو دی لاسٹ" اس کے مصنف تھے سماجی اصلاح کا کام کرنے والے اور نقاد انگریز جان رسکن ان کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ گاندھی جی نے محسوس کیا کہ اس کتاب کو شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنا مشکل ہے چنانچہ وہ رات بھر نہیں سوئے۔ اس کتاب میں رسکن نے جو خیالات پیش کیے تھے وہ دن رات

گاندھی جی کے دماغ میں گھومتے رہے انہوں نے اس کتاب کے بارے میں بعد کو لکھا " اس کتاب کے اصولوں کے مطابق " انہوں نے اپنی زندگی میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اصول کیا تھے ؟ انہیں گاندھی جی نے مختصر طور پر اس طرح بیان کیا :

" (۱) فرد کا فائدہ عوام کے فائدے میں شامل ہے (۲) وکیل کا کام اتنا ہی قیمتی ہے جتنا کہ ایک نائی کا کیونکہ دونوں کو اپنی محنت سے روزی کمانے کا حق ہے (۳) محنت کی زندگی (جیسے کہ زمین جوتنے والے کی یا کاریگر کی) سب سے اچھی زندگی ہے "

نئے خیالات سے ان کا دل اتنا متاثر ہوا کہ وہ فونکس چلے گئے جہاں انہوں نے رسکن کی کتاب کے اصولوں کو زندگی میں برتنے کی کوشش کی اور وہاں ایک کسان بستی بنائی جو ہانس برگ میں کام کرنے کی وجہ سے وہ فارم پر زیادہ نہیں ٹھہر پاتے تھے اس لیے انھوں نے 'انڈین اوپی نین' کی چھپائی فونکس میں ایک منیجر کے سپرد کردی خود تو وہاں کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے ہی جا پاتے تھے۔

شادی کے بارے میں بھی ان کے خیالات بدل رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے برہمچاری بننے کا فیصلہ کیا کستوربائی ان کے خیالات سے واقف تھیں اور نفس کشی کے اس کام میں ان کے ساتھ شریک تھیں۔ ایسا فیصلہ کرنے کی وجہ گاندھی جی کے الفاظ میں یہ تھی کہ " لذت اور ترک ایک ساتھ ممکن نہیں "

گاندھی جی جن اچھے کاموں میں لگے تھے ان میں وہ اور تیزی کے ساتھ لگ گئے انہوں نے اپنی ساری کمائی جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی مدد کے کاموں میں لگا دی اب ان کے سامنے ایک نئی مہم آگئی وہ یہ کہ انھیں معلوم ہوا کہ نیا قانون آنے والا ہے جس کے ذریعہ ہندوستانیوں کے ساتھ اور زیادہ امتیاز برتا جائے گا جیسے کہ ان کے لیے نشان انگوٹھا لگانا اور فوٹو دکھانا ضروری ہوگا۔ نئے قانون کے ماتحت پولیس جب چاہے ہندوستانیوں کے گھر میں گھس سکتی تھی اور کسی وقت بھی رجسٹریشن سرٹیفکٹ دکھانے کے لیے طلب کرسکتی تھی۔ یہ باتیں معلوم کرکے گاندھی جی میں اور زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور وہ اپنے کام میں زیادہ تیزی سے لگ گئے

کبھی کبھی گاندھی جی بڑے مایوس ہو جاتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں رہتے رہتے بارہ برس پورے ہو رہے تھے لیکن ابھی تک ہندوستانیوں کو ابتدائی شہری حق رائے دہی دلوانے میں انہیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی اور نہ وہ گوروں پر یہ اثر ڈالنے میں کامیاب ہوئے تھے کہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ شرافت کا برتاؤ کریں کیونکہ ابھی تک ہندوستانیوں کو نہ تو ووٹ دینے کا حق ملا تھا اور نہ وہ سرکاری

نوکری کر سکتے تھے۔

گاندھی جی کے خیالات اب ایک ایسے نقطے پر پہنچ رہے تھے جس کا اثر پوری دنیا پر پڑنے والا تھا اس کا تعلق جد و جہد کے اس طریقے سے تھا جو جنوبی افریقہ کے ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اپنانے جا رہے تھے۔ شروع میں ان کا طریقہ صرف یہی تھا ـــ ایک ذریعہ، ایک منصوبہ ایک جنگی طریقہ پھر اس نے زندگی کے اصول کا روپ اختیار کر لیا اس نقطہ نظر کا نام تھا ستیہ گرہ یا عدم تشدد کے ساتھ درست اقدام۔ ہم جلد ہی اس طاقتور خیال کو گاندھی جی کی زندگی میں عملی جامہ اختیار کرتے دیکھیں گے۔

۹۔ ستیہ گرہ کا استعمال

گاندھی جی اور دوسرے ہندوستانی لیڈروں کی کوششوں کے باوجود جنوبی افریقہ میں لازمی رجسٹریشن کا قانون ۱۹۰۷ء میں منظور ہو گیا اور اس کے خلاف ان کی مہم ناکام ہو گئی لیکن ناکامی کے باوجود ستیہ گرہ برابر جاری رہی۔ اگلا قدم تھا ہندوستانیوں کے ساتھ ناانصافی کرنے والے قانون کا نئے طریقے سے مقابلہ کرنا۔

گاندھی جی اس ستیہ گرہ کی تحریک کے روح رواں تھے ان کی زندگی کے حالات لکھنے والے ایک مصنف نے اس وقت کا ان کا حلیہ اس طرح کا بتایا ہے: "ان کا قد اوسط تھا، وہ دُبلے پتلے تھے لیکن چہرے پر نور اور سچائی کی جھلک پائی جاتی تھی، رنگ سانولا تھا جب وہ مسکراتے تھے تو چہرہ روشن ہو جاتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت اور پاکیزگی پائی جاتی تھی، ستیہ گرہی ہونے کی بنا پر وہ ننگے پاؤں رہتے تھے وہ دھوتی کے اوپر اونچے گلے کا کرتا پہنتے تھے جس کی آستین کلائی تک ہوتی تھیں اور اس کی لمبائی گھٹنوں تک۔ ان کے ایک کاندھے پر جھولا لٹکا رہتا تھا جس کی پٹی پیٹھ سے ہوتی ہوئی سامنے سینے پر آتی تھی ساتھ ہی ساتھ پانچ فٹ کے لگ بھگ لمبا ایک ڈنڈا بھی ہاتھ میں رہتا تھا۔ یہ لباس ایک فوجی کے لیے تو عجیب و غریب سمجھا جائے گا لیکن وہ کوئی عام فوجی تو تھے نہیں جو عام ہتھیار استعمال کرتے۔

تحریک کے سلسلہ میں ستیہ گرہ سماج کے نام ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اسی کی رہنمائی میں ٹرانسوال میں رہنے والے تمام ہندوستانیوں نے رجسٹریشن دفتروں کا بائی کاٹ کیا اور وہاں دھرنا بھی دیا۔ ہندوستانیوں کو دکھ پہنچانے والا ایک اور قدم ٹرانسوال مجلس قانون ساز نے یہ اٹھایا کہ 'داخلہ بند' نام کا ایک

وہاں پہنچتے ہی ایک پٹھان مِلا جس کا نام میر عالم تھا اور جو گاندھی جی کا مؤکل رہ چکا تھا اس نے پوچھا "آپ کہاں جارہے ہیں"؟

گاندھی جی نے جواب دیا "میرا ارادہ رجسٹریشن سرٹیفکٹ لینے کا ہے" یہ سنتے ہی اس نے فوراً ان پر حملہ کر دیا۔ ان کے سر پر چوٹ آئی۔ گاندھی جی چیخے۔ "ہے رام" یہ کہتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے دوسرے پٹھانوں نے انہیں لاتیں ماریں۔ گاندھی جی کو اٹھا کر بغل کے ایک دفتر کے کمرے میں لے جایا گیا۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کے گالوں اور ہونٹوں پر زخم آئے ہیں اور ان کی پسلیوں اور منہ میں درد ہو رہا ہے۔

اُن سے جب مقدمہ چلانے کو کہا گیا تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ حملہ آوروں کو چھوڑ دیا جائے وہ سمجھتے تھے کہ وہ صحیح راستے پر ہیں۔ میں ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے خاص طور پر میر عالم کے بارے میں پوچھا جو دوسرے حملہ آوروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ گاندھی جی نے تو مقدمہ نہیں چلایا لیکن پھر بھی اسے تین مہینے کی سزا ہو گئی۔

گاندھی جی نے یہ بھی پوچھا کہ رجسٹرار صاحب آئے ہیں کہ نہیں میں چاہتا ہوں کہ میں جس کام کے لیے آیا تھا وہ کر ڈالوں یعنی انگوٹھے کا نشان لگا دوں۔ گاندھی جی نے میر عالم کے متعلق جو فکر کا اظہار کیا تھا اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور ان کی تعریف کی۔ میر عالم ہندوستان چلا گیا اس نے وہاں سے گاندھی جی کو ایک خط لکھا۔ جس میں اس نے لکھا " مجھے امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے ایک گجراتی اخبار سے ٹرانسوال میں ہونے والی باتوں کا مجھے پتہ چلا پنجاب پہنچ کر میں ان باتوں کو وہاں کے اخبار میں بھی چھپواؤں گا۔ مہربانی کر کے بتایئے کیا حکومت قانون کے بارے میں سمجھوتے پر راضی ہو گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مقدمے کے متعلق ساری خبریں بھیج کر مجھے ممنون کریں گے .... سرحد جانے پر میں اپنے دوستوں سے اس کے بارے میں کہوں گا اور جو بھی مدد کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔ میں حتی الامکان سب کچھ کروں گا۔ اور جب افغانستان جاؤں گا تو وہاں بھی ٹرانسوال کے متعلق لوگوں کو بتاؤں گا۔ کچھلیا صاحب سے .... اور تنظیم میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں سے میرا آداب کہیے۔ براہِ کرم اس خط کو ایک میٹنگ میں پڑھ کر سُنا دیجیے گا "

اس طرح ستیہ گرہ کا دوسروں پر ردِ عمل ہوتا ہے۔ گاندھی جی نے تشدد پر فتح حاصل کر لی تھی۔ کئی دن تک گاندھی جی جوہانس برگ میں اپنے ایک دوست کے یہاں رہے۔ وہاں اُن کی

قانون بنایا جس کے مطابق اب دوسرے ہندوستانی ریاست میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے خلاف بھی گاندھی جی نے تحریک چلائی، اس پر چھبیس[26] دوسرے لوگوں کے ساتھ انہیں جوہانس برگ چھوڑنے کا حکم ہوا جسے انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اسی کے ساتھ انہوں نے رجسٹری نہ کرانے کا الزام تسلیم کر لیا اور جب گاندھی جی نے تحریک کے لیڈر ہونے کی بنا پر قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں بھاری سے بھاری سزا دئے جانے کی مانگ کی تو عدالت حیرت زدہ ہو گئی انہیں دو مہینے کی سزا دی گئی۔ زندگی میں انھوں نے جو بہت سی سزائیں کاٹیں ان میں یہ پہلی سزا تھی۔

جلد ہی اس قانون کے خلاف درجنوں ستیہ گرہی ان کے ساتھ ہو گئے۔ ان کے برتاؤ اور بلند اخلاق سے جنرل جان کرسچین اسمٹس جو بوار لڑائی کے موقع پر قیادت کر رہے تھے اور وزیر مالیات و دفاع تھے بہت متاثر ہوئے انہوں نے کہا کہ اگر ہندوستانی ستیہ گرہی خوشی سے خود رجسٹریشن کے لیے تیار ہو جائیں تو قانون واپس لے لیا جائے گا۔ گاندھی جی نے یہ بات منظور کر لی لیکن اس پر عمل کرانا بڑا مشکل تھا کیونکہ جنگجو پٹھانوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ہندوستان کے شمال مغربی پہاڑی علاقے سے آنے والے یہ پٹھان برسوں پہلے افریقی ٹرانسوال میں آکر بس گئے تھے۔

ان میں سے ایک پٹھان نے جوہانس برگ کے جلسہ عام میں گاندھی جی پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے ساری ہندوستانی قوم کو دغا دی ہے اور اسے پندرہ ہزار پونڈ میں جنرل اسمٹس کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اس نے گاندھی جی کو دھمکی بھی دی۔ اس نے کہا "خدا کو گواہ کر کے قسم کھاتا ہوں جو شخص رجسٹریشن میں پیش قدمی کرے گا میں اسے مار ڈالوں گا"۔ گاندھی جی نے کھلم کھلا اس کی مخالفت کی اور کہا میں درخواست دوں گا اور نشان اپنا انگوٹھا بھی لگاؤں گا۔

بڑے ٹھنڈے دل سے انہوں نے کہا "موت تو ایک مقررہ وقت پر آنی ہی ہے بیماری یا اسی طرح اور ڈھنگ سے مرنے کے بجائے ایک بھائی کے ہاتھوں مرنا میرے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔ مارے جانے کی شکل میں اگر میرے دل میں مارنے والے کے خلاف غصہ اور نفرت کا خیال تک نہ ہو تو اس سے میرے مقصد میں مدد ملے گی اور آگے چل کر مجھے مارنے والا بھی میری بے گناہی محسوس کرے گا"

گاندھی جی نے رجسٹریشن کے لیے ۱۰ر فروری کی تاریخ مقرر کی اور سب سے پہلے وہ خود اس کے لیے آگے بڑھے۔ اس دن جب صبح کے وقت وہ سرکاری دفتر پہنچے تو لمبے اور تگڑے پٹھانوں کا ہجوم وہاں دکھائی دیا۔ وہ کمرے میں گئے پھر دوستوں کے ساتھ رجسٹریشن والے دفتر کی طرف بڑھے

اچھی طرح دیکھ بھال کی گئی اور وہ گھر فکر مند ہندوستانیوں کے لیے زیارت گاہ بن گیا۔ آگے چل کر گاندھی جی پر اور کئی حملے کیے گئے لیکن ہر بار ان کے ساتھیوں نے انہیں بچا لیا۔

جنرل اسمٹس نے ذاتی طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر ہندوستانی اپنی مرضی سے رجسٹریشن کرالیں تو قانون واپس لے لیا جائے گا لیکن انہوں نے اپنا یہ وعدہ پورا نہیں کیا اور قانون واپس نہیں لیا گیا۔

اس کے جواب میں ہندوستانیوں نے ایک بڑی بھاری ہولی جلائی اور اس میں اپنے سرٹیفکٹ ڈال دیے۔ اخبار والوں نے اس واقعہ کو بوسٹن ٹی پارٹی کے مثل بتایا۔ پرانے قانون ہٹانے کے بجائے حکومت نے اور زیادہ سخت قانون پاس کیے۔ جس میں سے ایک کے مطابق ہندوستانی ٹرانسوال میں رہ تک نہ سکتے تھے۔

اس نئے اقدام کی بھی مخالفت کی گئی نیٹال کے ہندوستانی ٹرانسوال میں داخل ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ دوسرے لوگ جو پہلے سے ٹرانسوال میں رہ رہے تھے اور کولنس (مقامی) کہلاتے تھے۔ بلا لائسنس کے پھیری والے بن گئے اور قانون کے خلاف ورزی کے جرم میں جیل بھیج دیے گئے۔ گاندھی جی پھر جیل گئے۔ اب وہ اتنے مقبول ہو گئے تھے کہ لوگ انھیں 'گاندھی بھائی' کہنے لگے تھے۔ اس مرتبہ انھیں نمبری قیدیوں میں رکھا گیا اور سخت زمین کھودنے کی مشقت دی گئی انہوں نے محنت کا یہ کام خوشی سے منظور کر لیا۔

کام کے بعد جیل میں جو وقت ملتا اس میں خوب کتابیں پڑھتے — شری مد بھگود گیتا، جان رسکن کی کتابیں، امریکی فلسفی ہنری ڈیوڈ تھورو کی تصانیف وغیرہ۔ لیکن اب بھی وہ لباس کے اعتبار سے 'سماجی مصلح' کے بجائے وکیل ہی معلوم ہوتے تھے سوائے اس کے کہ وہ ستیہ گرہی کا لباس پہنے ہوں۔

حکومت کا اگلا قدم یہ تھا کہ ایک قانون بنا کر ایسے ہندوستانیوں کو جو ساری عمر یہاں رہے تھے نکال باہر کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی کو جنوبی ہندوستان سے مدد مل گئی اور انہوں نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی اور بے دخلی کا یہ قانون ناجائز قرار دے دیا گیا۔

اس عرصے میں ستیہ گرہ تحریک جاری رہی لیکن اس کی رفتار سست تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکومت ہندوستانیوں پر سختی بہت کر رہی تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ جن کا روپیہ ہندوستانی تاجروں پر باقی تھا وہ مخالفت پر آمادہ ہو گئے تھے وہ مطالبہ کرنے لگے تھے کہ ان کی کل رقم فوراً

واپس کر دی جائے ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہندوستانیوں کے لیے مشکل تھا۔

۱۹۰۹ء میں جیل سے نکلنے کے بعد گاندھی جی نے ایک بار پھر یہ فیصلہ کیا کہ انگلستان جا کر جنوبی افریقہ میں بسے ہندوستانیوں کے لیے مدد حاصل کی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ وہاں اور دشواریاں دور کرانے کی کوشش کریں گے۔ جا کر انگریز لیڈروں سے ملیں گے اور ان کے سامنے سارے مسائل رکھیں گے اس دورے سے صرف اتنا فائدہ ہوا کہ انگریز لیڈروں کو ہندوستانیوں کی دشواریوں کا علم ہو گیا مگر دشواریاں دور نہیں ہوئیں ہاں برطانیہ میں چھ مہینے رہنے سے گاندھی جی کو ہندوستان کی صورت حال سے زیادہ واقفیت ہو گئی۔

برطانیہ سے جنوبی افریقہ واپس ہوتے ہوئے گاندھی جی نے اپنی پہلی کتاب "ہند سوراج" لکھی۔ انہوں نے یہ کتاب "کل ڈونن کیل" نامی جہاز میں سفر کرتے ہوئے گجراتی زبان میں لکھی تھی اور بعد میں خود ہی اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ انہوں نے جہاز کی عام سرگرمیوں میں حصّہ لینے کے بجائے اپنا زیادہ تر وقت کتاب لکھنے میں صرف کیا انہوں نے لکھنے کے لیے ان کاغذات کو استعمال کیا جو جہاز پر سفر سے متعلق ملے تھے اس کتاب کا پورا مسودہ دس دن سے کم میں ہی تیار کر لیا۔ جب ان کا داہنا ہاتھ تھک جاتا تو وہ بائیں ہاتھ سے لکھتے۔

'ہند سوراج' مضمون "انڈین اوپی نین" میں ہفتہ وار قسطوں میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کتاب کا مسودہ ان کے خاندان کے ایک شخص نے اپنے پاس رکھ لیا بعد میں جب اس کی اہمیت محسوس کی گئی تو اصل کتاب شائع کی گئی اس میں ۲۷۵ صفحے تھے شائع کرنے سے پہلے اس میں صرف تین سطریں بدلی گئیں۔ چالیس سال بعد گاندھی جی نے کہا کہ میں اس میں صرف ایک لفظ بدلنا چاہوں گا باقی میں کوئی تبدیلی نہیں کرنی ہے۔

گاندھی جی کا تمام نجی پیسہ ستیہ گرہ میں لگ گیا ہندوستان سے دوست جو مدد دیتے تھے اسی سے خاندان کی کسی طرح گذر بسر ہوتی تھی۔

ایک جرمن انجینئر دوست سے ایک انوکھی مدد ملی۔ انہوں نے جوہانس برگ سے بیس[۲] میل کی دوری پر ۱۱۰۰ ایکڑ کا پھلوں کا باغ خریدا اور گاندھی خاندان اور ستر دوسرے ہندوستانیوں کو بغیر کسی کرائے کے رہنے کے لیے دے دیا۔

۱۰۔ ٹالسٹائی فارم سے ہندوستان

گاندھی ٹالسٹائی سے کافی متاثر تھے اسی لیے انہوں نے اس فارم کا نام ان ہی کے نام پر ٹالسٹائی

فارم رکھا اور وہاں خود کفیل زندگی بسر کرنے کا تجربہ شروع کیا۔ خود کفیل ہونے کی اس کوشش کو اس زمانے میں 'اپنا کام آپ کرو' پروگرام کہا جائے گا۔ ٹالسٹائی فارم پر رہنے والے ہندوستانیوں نے بہت سے کام سیکھے ان میں موچی کا کام بھی تھا۔ گاندھی جی بھی سیکھنے والوں میں شامل تھے۔

فارم سے جوہانس برگ گاندھی جی پیدل ہی آتے جاتے وہ فارم پر برابر ایک کے بعد دوسرا کام سیکھ رہے تھے زمین گوڑنے اور بونے کے کام میں بھی حصہ لیتے اور بڑھئی گیری کا کام بھی بڑی محنت سے سیکھتے۔ نیلی جانگھیا اور بنیان پہنے ہوئے وہ فارم کے ایک لیڈر کے لیے مکان بنانے میں مدد کرتے روزانہ چلچلاتی دھوپ میں برابر کام کرتے رہتے۔ آخر کار کام پورا کر کے ہی چین لیا۔ ۱۹۱۱ء تک وہ ٹالسٹائی فارم میں رہے اور وہاں ہر طرح کے کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ مختلف سماجی کام بھی انجام دیتے اور غذا کے بارے میں اپنے خیالات کے مطابق تجربات کرتے رہے۔

ٹالسٹائی فارم پر گاندھی جی نے جو تجربے کیے ان میں ایک کوایجوکیشن کے متعلق تھا وہ شریر لڑکوں اور شرمیلی لڑکیوں کو ایک ساتھ نہانے بھیج دیتے تھے وہ انہیں ضبطِ نفس کی اہمیت پہلے ہی بتا دیتے تھے۔ نہانے والے ایک ٹولی بنا کر جاتے تھے اور تنہائی سے ہمیشہ بچا کرتے تھے۔ اکثر گاندھی جی خود نگرانی کے لیے موجود رہتے تھے۔

گاندھی جی ایک کھلے برآمدے میں سوتے تھے اور لڑکے لڑکیاں ان کے چاروں طرف لیٹتے تھے فارم پر کوئی چارپائی استعمال نہیں کرتا تھا سب فرش ہی پر لیٹتے تھے جیسا کہ ہندوستان میں عام طور پر وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں چارپائی نصیب نہیں ہے۔ فارم پر رہنے والوں کے پاس دو کمبل رہتے تھے ایک بچھانے کے لیے اور ایک اوڑھنے کے لیے اور ان کا تکیہ لکڑی کا ہوتا تھا۔

کوایجوکیشن کا تجربہ بہت آسانی کے ساتھ تو نہیں چلا لیکن تجربے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوا۔ فارم پر رہنے سہنے اور کام سیکھنے میں سب ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔

فارم کے پروگرام میں دوائیں شامل نہیں تھیں اگرچہ وہاں سے شہر دور تھا لیکن اس کے باوجود فارم پر دوائیں رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس زمانے میں گاندھی جی کو قدرتی علاج پر بڑا اعتماد تھا۔ فارم پر بیماری کا کوئی ایسا معاملہ نہیں ہوا جس میں ڈاکٹر کی مدد کی ضرورت پڑتی قدرتی علاج میں گاندھی جی کے عقیدے کی شہرت دور دور تک ہوگئی اور باہر سے بھی لوگ ٹالسٹائی فارم پر علاج کے لیے آنے لگے۔

یہ سب تجربات کرتے ہوئے گاندھی جی خود بھی بہت کچھ سیکھتے رہے انہوں نے نہ صرف یہ کہ بڑھئی گیری کے عملی کام میں مہارت حاصل کی بلکہ ایمانداری کا سبق بھی سیکھا۔

کسی شخص کو پیسے کی ضرورت تھی، اس نے گاندھی جی سے تین سو پونڈ (لگ بھگ چھ ہزار روپے) قرض مانگے۔ خود ان کے پاس تو کچھ تھا نہیں لیکن اس بے سہارا آدمی کی مدد کے لیے گاندھی جی نے نیٹال کانگرس کے پیسے میں سے جو ان کے پاس جمع تھا یہ رقم اسے دے دی جب وہ پیسہ دے چکے تو انہیں اپنے اوپر بڑا غصہ آیا۔

بعد میں انہوں نے اس معاملے کا اپنے ایک دوست سے ذکر کرتے ہوئے بتایا "اس رات مجھے نیند نہیں آئی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے ایسا گناہ کیوں کیا۔ عوامی پیسے میں سے چاہے کسی کی ہمدردی ہی کے لیے کیوں نہ ہو مجھے پیسہ نکالنے کا کیا حق تھا؟ اگر وہ پیسہ جلد نہ لوٹایا جا سکا اور میں اچانک مرگیا تو یہ قرض کیسے ادا ہوگا؟ اس خیال سے میں پریشان ہوگیا۔ میں نے خدا سے دعا کی اور اس قرض کو جلد از جلد ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور آئندہ کے لیے عہد کیا کہ عوامی پیسے کو کسی شخص کے لیے استعمال نہ کروں گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہی مجھے نیند آسکی"۔

اگلے دن دفتر پہنچنے پر انہیں ایک تار ملا اس میں بتایا گیا تھا کہ ایک بات یہ ہوگئی ہے کہ ہندوستانیوں کے ایک گروہ پر نیٹال اور ٹرانسوال کی سرحد پار کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ ان لوگوں کی پیروی کے لیے ان سے مدد مانگی گئی تھی۔ گاندھی جی اس گاؤں میں پہنچے جہاں نوّے آدمی پکڑ کر رکھے گئے تھے انہوں نے مجسٹریٹ کی عدالت میں ان لوگوں کی جانب سے وکیل کی حیثیت سے پیروی کی اور وہ سب چھوڑ دئے گئے۔ اس مقدمے میں انہیں جو فیس ملی اس سے انہوں نے فوراً وہ رقم ادا کردی جو انہوں نے ضرورت مند آدمی کو قرض دی تھی۔

اسی سال جنوبی افریقہ کی حکومت نے اعلان کیا کہ ہندوستانیوں کے خلاف نسلی امتیاز کی بنا پر جو پابندی لگائی گئی ہے ہٹائی جائے گی ساتھ ہی ساتھ جیلوں سے ستیہ گرہی قیدی بھی رہا کردیے گئے لیکن قلی مزدوروں پر ٹیکس جاری رہا۔ آنے والے ہندوستانیوں کے خلاف رنگ امتیاز بدستور باقی رہا۔

سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا کہ تمام غیر عیسائی شادیاں غیر قانونی ہیں اس سے ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اس کی زد میں ہندو، مسلمان، پارسی سبھی آتے تھے کیونکہ اس قانون کے مطابق اُن کے بچے ناجائز ہو جاتے تھے۔

اس آخری امتیازی قدم سے ستیہ گرہ میں اور جان آگئی لگ بھگ ساٹھ ستیہ گرہیوں نے اپنی نئی مہم شروع کی کستوربائی اور دوسرے پندرہ ہندوستانی نیٹال کی طرف سے ٹرانسوال میں داخل ہوئے اور پکڑے گئے کیونکہ ان کے پاس سرحد پار کرنے والا پرمٹ نہیں تھا۔ گیارہ آدمی ٹرانسوال سے نیٹال کی طرف آئے اور وہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اسی درمیان نیٹال کی کانوں میں کام کرنے والے ہندوستانی مزدوروں نے ان کی ہمدردی میں ہڑتال کر دی۔

کانوں کے مالکوں نے کان مزدوروں کے لیے پانی اور بجلی کی فراہمی بند کر دی اس کا مقصد بدلا لینا اور ہڑتال ختم کرانا تھا اس طرح ڈھائی ہزار بے پڑھے لکھے کان مزدور نہ صرف بے کار ہو گئے بلکہ محتاجی کی زندگی بسر کرنے لگے گاندھی جی نے انہیں ہمت دلائی اور کہا کہ وہ ٹالسٹائی فارم کے لیے پیدل روانہ ہو جائیں۔ گاندھی جی بھی گرفتار کر لیے گئے ضمانت پر رہا کیے گئے، دوبارہ پکڑے گئے اور ضمانت پر چھوڑے گئے۔ اس کے بعد پھر تیسری بار گرفتار کر لیے گئے۔

تیسری گرفتاری کے بعد ان پر مقدمہ چلا اور ساٹھ پونڈ (لگ بھگ بارہ سو روپئے) جرمانہ کیا گیا۔ جرمانہ نہ ادا کرنے کی شکل میں نو مہینے کی سزا دی گئی۔ گاندھی جی نے جرمانہ نہیں دیا اور جیل چلے گئے۔ پھر مارچ کرنے والے بھی گرفتار کر لیے گئے اور اسپیشل ٹرین کے ذریعہ نیٹال بھیج کر وہاں کے جیل خانے میں بند کر دئے گئے ان کو سزا یہ دی گئی کہ وہ کانوں میں کام کریں لیکن انہوں نے کان میں کام کرنے سے انکار کر دیا تب انھیں کوڑے لگائے گئے۔

اس پر نیٹال کے دوسرے ہندوستانیوں نے بھی ہڑتال کر دی اور وہ لوگ بھی بے رحمی سے مارے گئے گاندھی جی کو دوسرے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا اور ہتھکڑی بھی ڈالی گئی۔

جلد ہی ان واقعات کی خبر ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ تک پہنچ گئی۔ انہوں نے جنوبی افریقہ کی حکومت کے ان اقدامات کی مذمت کی اور کہا کہ یہ باتیں کسی مہذب ملک کو زیب نہیں دیتیں۔ انہوں نے مظالم کی جانچ کی مانگ کی۔ ہندوستان کے وائسرائے کی اس یقین نہ آنے والی حمایت سے گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کا بہت حوصلہ بڑھا۔

تین رکنی کمیشن بٹھایا گیا لیکن اس میں ہندوستانی نمائندہ ایک بھی نہ تھا یہی نہیں بلکہ تین میں سے دو ممبر تو ہندوستانیوں کے خلاف نقطۂ نظر رکھنے کے لیے مشہور تھے اس کے باوجود ایک سمجھوتے پر دستخط ہو گئے اور ہندوستانیوں کے کچھ مطالبے پورے ہو گئے جیسے تین پونڈ والے ٹیکس کا ہٹنا، ہندوستانی شادیوں کو جائز قرار دینا جنوبی افریقہ میں داخلے کی اجازت کے لیے ایک

معمولی سرٹیفکٹ کو منظوری دے دینا ان کے علاوہ کچھ اور کم اہمیت والی باتیں۔ لیکن ابھی کچھ مطالبے پورے نہیں ہو سکے جیسے زمین خریدنے کا حق اور شہروں اور بستیوں میں ان کی الگ رہائش۔ آٹھ سال کی جدوجہد کے بعد اتنی کامیابی حاصل ہونے پر ستیہ گرہ کی تحریک بند کر دی گئی۔

لیکن اطمینان نصیب ہونے والا نہیں تھا۔ ۱۹۱۴ء میں رنگ امتیاز والے نئے قانون لائے گئے۔ اس درمیان ہمت والے کچھ لیڈروں کا انتقال ہو گیا اور گاندھی جی ہندوستان واپس گئے وہاں اہنسا میں ان کی رہنمائی کی سخت ضرورت تھی۔ اُنکے چلے جانے سے نیٹال کانگرس جسے انہوں نے قایم کیا تھا کمزور ہو گئی۔

گاندھی جی نے افریقہ میں جو کام کئے تھے اس کی شہرت ہندوستان میں کافی ہو گئی تھی یہاں سے جو لوگ جنوبی افریقہ جاتے تھے وہ وہاں سے گاندھی جی کی کامیاب قیادت کی خبریں لے کر لوٹتے تھے۔ اس لیے جب وہ ۹ر جنوری ۱۹۱۵ء کو بمبئی پہونچے تو ان کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا گیا افریقہ چھوڑنے سے پہلے انہوں نے ایک انوکھی بات کی جو وہی کر سکتے تھے۔ جیل میں اپنے ہاتھ سے بنائی گئی ایک جوڑی چپل گاندھی جی نے جنرل اسمٹس کو تحفے میں پیش کی۔ پچیس سال تک یہ چپل ان کے پاس رہی۔ اس کے بعد گاندھی جی کی سترویں سالگرہ کے موقعہ پر اسمٹس نے یہ چپل دوستی کی علامت کے طور پر ہندوستان بھیج دی اور لکھا :-

" بیسوں سال میں نے یہ چپلیں پہنیں ... اگرچہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسے بزرگ آدمی کے جوتوں میں کھڑے ہونے کے لائق بھی نہیں ہوں "

لیکن ہندوستان واپس آنے پر گاندھی جی نے مالدار لوگوں کے درمیان بے چینی محسوس کی اگرچہ وہ لوگ ان کی اور کستور بائی کی بڑی خاطر کرتے تھے۔ وہ سادگی اور سادہ لوحی سے رہتے تھے۔ حالانکہ حکومت ہند نے انہیں سونے کا تمغہ انعام میں دیا تھا ہندوستان کے برطانی حکام ابھی تک انہیں باغی نہیں سمجھتے تھے۔

گاندھی جی نے کستوربا کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا دونوں کا لباس سادہ تھا۔ گاندھی جی کے سر پر پگڑی، کاندھے پر لمبا انگوچھا، بدن پر کرتا، دھوتی اور ساتھ ہی ساتھ اونی شال اور سب کپڑے سفید رنگ کے۔ ان کے مقابلے میں ان کی چوڑی کالی مونچھیں اور چمکتی ہوئی گہری آنکھیں تھیں۔ کستوربا اکثر زری کے ہلکے کام والی ساڑی بلاؤز یا چولی پہنتی تھیں اور کلائی میں ایک چوڑی۔ دونوں زیادہ تر پیدل چلتے تھے کئی سال بعد گاندھی جی کی ایک انگریز چیلی نے جن کا نام میرابہن ہے (یہ

نام بھی گاندھی جی نے رکھا تھا) ان کے بارے میں یہ لکھا۔

اُن کی صورت شکل کوئی شاندار نہیں تھی اور نہ ان کے بولنے کے ڈھنگ میں کوئی خاص بات تھی حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی انتہائی سادگی ہی دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی تھی اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایسی شخصیت سے اس کا سامنا ہے جس کی انوکھی عظمت اس کے جسم اور آواز کو۔۔ جن کے ذریعہ وہ عظمت ظاہر ہوتی تھی۔۔ ہمدردی سے بھری ہوئی، غیر مصنوعی خاکساری سے روشن کر دیتی تھی۔

موہن داس گاندھی میاں بیوی پوربندر اور راج کوٹ گئے ان دونوں شہروں سے ان کا پرانا تعلق تھا۔ وہ عظیم بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور سے ملنے بھی گئے جنھیں ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز ملنے والا تھا۔ شمال مشرقی ہندوستان میں شانتی نکیتن نام کا ٹیگور کا آشرم تھا وہاں گاندھی جی کچھ عرصے تک گرد دیو اور چارلس اینڈ روز، ونس ٹین لے پیرسن اور ڈ ّتاترئے کالکر کے ساتھ رہے۔ ان سب نے جب وہ جنوبی افریقہ میں تھے تو ان کے کام کے لیے ہندوستان سے مدد بھی بھیجی تھی۔ گاندھی جی کلکتہ گئے اور برما کے کچھ شہر بھی دیکھے ان کو دیکھنے کے لیے بھیڑ لگنا شروع ہو گئی تھی۔

اس درمیان ۱۹۱۴-۱۸ء کی لڑائی میں ہندوستان کے حکمراں اُلجھتے جا رہے تھے گاندھی جی نے طے کیا کہ ہمیں کوئی ایسی سیاسی کارروائی نہیں کرنی چاہیئے جس سے انگریزوں کو دشواری کا سامنا کرنا پڑے سچ تو یہ ہے کہ گاندھی جی کا خیال تھا کہ فی الحال سیاست میں پڑنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے ۱۹۱۶ء تک گاندھی جی یہی امید ظاہر کرتے رہے کہ اگر سامراج کی تاریخ کے اس اہم موقعے پر ہندوستان برطانیہ کے ساتھ تعاون کرتا ہے تو جنگ کے بعد اسے آزادی مل جائے گی۔ ملک میں اس وقت جو سیاسی جھگڑے چلا کرتے تھے جیسے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتے کی بات چیت ان سے وہ کوسوں دور تھے پاکستان ابھی مستقبل کے پیٹ میں تھا وہ ۱۹۴۷ء میں بنا۔

۱۹۱۶ء میں گاندھی جی بہار کے چمپارن ضلع میں گئے وہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اور انگریز مالکوں کے نیل کے کھیتوں پر کسانوں کے ساتھ جو ناانصافی ہوتی تھی اسے ختم کیا جائے۔ وہاں جا کر وہ کسانوں کی حالت کی جانچ کرنے لگے اور اسی درمیان گرفتار کر لیے گئے کیونکہ ضلع چھوڑنے کے سرکاری حکم کو انہوں نے نہیں مانا لیکن بہار کی حکومت نے ان کی گرفتاری کو غلط قرار دیا اور انہیں رہا کر دیا۔

اس کے بعد گاندھی جی نے بڑی تفصیل سے صورت حال کا مطالعہ کیا حاکموں اور رعایا سب کی

گواہیاں لیں اور حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کا حکومت پر بھی اثر پڑا اس نے اس معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی کمیٹی نے کئی ایسی سفارشیں کیں جن کی بنا پر مالکوں نے کچھ رعائتیں دینا منظور کیا اور کسانوں کی برسوں پرانی مصیبت دور ہو گئی۔

گاندھی جی نے دیکھا کہ کسانوں کی مصیبت کی جڑ ہے ان کے اندر تعلیم کی کمی اس لیے انہوں نے اپنے خاندان اور دوستوں کی مدد سے چمپارن کے گاؤں میں اسکول کھول کر تعلیم دینے کا ایک پروگرام شروع کیا۔ دیہات کے رہنے والوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے ساتھ ساتھ صحت اور صفائی کے ابتدائی طریقے بھی سکھائے جاتے تھے۔

اس درمیان احمد آباد کے کپڑے کی ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے زیادہ مزدوری کے لیے ہڑتال کر دی وہ دن بھر بے کار رہتے جس کی وجہ سے انہیں اپنے کھانے کے لیے انتظام کرنا دشوار ہو گیا۔ تب گاندھی جی نے انہیں نئے دھندے سکھانے میں مدد کی دوسری طرف ہڑتالیوں نے صفائی مہم میں گاندھی جی کی مدد کی گاندھی جی کو امید تھی کہ یہ مزدور جن کی تعداد پانچ سے دس ہزار تک ہے ستیہ گرہ کے ذریعہ اپنے مقصد کو پورا کرلیں گے لیکن ستیہ گرہ کی تحریک انہیں متاثر نہ کر سکی تب ان مزدوروں کا ستیہ گرہ پر عقیدہ مضبوط کرنے کی غرض سے گاندھی جی نے برت رکھا اور کامیاب ہوئے ان مزدوروں نے ستیہ گرہی بننے کا عہد کیا برت کے چار دن بعد سمجھوتہ ہو گیا اور ہڑتالی مزدوروں کی مانگیں مل مالکوں نے منظور کرلیں۔

اس کامیابی کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ مالک لوگ ثالثی کے لیے تیار ہو گئے۔ ہندوستان کی صنعتی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ثالثی کے اصول کو تسلیم کیا گیا۔ بعد میں گاندھی جی نے یہ بات مان لی کہ ان کے برت میں دباؤ تھا کیونکہ مل مالکوں کو وہ ذاتی طور پر جانتے تھے اور وہ ان کے دوست تھے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر مل مالک ان سے واقف نہ ہوتے تو برت رکھ کر جان کی بازی لگانے سے ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

کچھ سال بعد گاندھی جی نے ان مزدوروں کے فائدے کے لیے احمد آباد میں ایک مزدور مہاجن سنگھ بنایا آگے چل کر یہ ادارہ کافی مضبوط ہو گیا اور اپنی ضروریات پوری کرنے لگا جیسے۔ اسپتال، کتب خانہ، بینک، اسکول اور ایک اخبار اس کے علاوہ وہ سرگرمی سے دوسری سماجی اصلاحات کرنے لگا۔ یہ ادارہ اپنے ممبروں کو نئے نئے صنعتی کاموں کی ٹریننگ بھی دینے لگا تاکہ نوکری چھوٹنے پر وہ بھوکے نہ مریں۔

اس اہم واقعے کے بعد گاندھی جی ایک دوسری جدوجہد میں لگ گئے گجرات (جو اس وقت بمبئی پریسی ڈنسی کا ایک جز تھا۔) کے کھیڑا ضلع میں کسانوں سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جسے وہ لوگ نا انصافی سمجھتے تھے۔ گاندھی جی نے بھی اسے غلط خیال کیا اور اس ٹیکس کے خلاف کامیابی کے ساتھ تحریک کی رہنمائی کی۔

گاندھی جی نے ایک ایسی بات بھی کی جس کے بارے میں کافی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ بات تھی جنگ میں بھرتی کرانے میں انگریزوں کی مدد کرنا۔ یہ کام ان کے اہنسا کے اصولوں کے خلاف تھا بہر حال ان کے پاس اس کا جواب بھی تھا۔

۱۱۔ بہادر اور بزدل

گاندھی جی نے جب جنگ کی پرزور حمایت کی تو ان کے قریبی انگریز دوست سی، ایف اینڈ روز نے خاص طور پر بے چینی محسوس کی۔ کچھ دوسرے لوگوں کو بھی پریشانی ہوئی لیکن وہ جنگ خود تو لڑنے گئے نہیں انہوں نے صرف بھرتی میں مدد کی ان کی رائے یہ تھی کہ اگر تشدد کے ذریعہ بنی ہوئی حکومت کے ماتحت رہ کر ہم فائدہ اٹھاتے ہیں تو جنگ کی صورت میں اس کی مدد کرنا ہمارے لیے ضروری ہے یا پھر ہم عدم تعاون کریں اور جہاں تک ہوسکے ان تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیں جو اس حکومت کے ماتحت ہمیں حاصل ہیں۔ عدم تشدّد پر عقیدہ رکھنے والے ایک امرکی کربی پیج (جو گاندھی جی کو بھی جانتے تھے) نے بعد میں کہا تھا کہ گاندھی جی کا تشدّد پر بالکل عقیدہ نہیں تھا اور جو وہ کہتے تھے اس سے زیادہ کرتے تھے۔

یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ گاندھی جی نے کسی وقت بھی بزدلی کی حمایت کی انہیں یہ کبھی پسند نہیں تھا کہ برائی کے خلاف عدم تشدد کے طریقے سے بزدل لوگ فائدہ اٹھائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں بزدلی اور تشدّد میں سے ایک ہی راستہ اختیار کرنا ہو تو میں صلاح دوں گا کہ تشدد کا راستہ اختیار کیا جائے" وہ جانتے تھے کہ بزدلی سے اخلاقی گراوٹ پیدا ہوتی ہے لیکن تشدد سے ایسا نہیں ہوتا۔

کچھ لوگوں نے بزدلی اور تشدد سے متعلق ان کے اس خیال کو ایٹمی ہتھیاروں کو جائز قرار دینے کے لیے استعمال کیا کچھ لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گاندھی جی کسی نہ کسی صورت میں تشدد کو قبول کرتے تھے یا اس کی حمایت کرتے تھے۔ اس لیے جب ایک امن پسند امرکی ۱۹۵۸ء کے آس پاس ونوبا جی سے ملا تو اس نے گاندھی جی کے اس خیال کی وضاحت چاہی ونوبا جی گاندھی جی

کے ایسے چیلے تھے جو ہندوستان میں ان کے اصولوں پرعمل کرنے کی کوشش کرتے رہے وہ گاندھی جی کے بہت قریب رہ چکے تھے۔ ونوبا جی نے کہا کہ گاندھی جی کے اس خیال پر ان کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہیے۔ یہ بات صرف ایک بار کہی گئی ہے اور گاندھی جی نے اسے کبھی دہرایا نہیں دوسرے الفاظ میں یہ بات گاندھی جی کے اصولوں کا مرکزی نقطہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بات جنگ سے پہلے کہی گئی تھی جب نہ تو تباہی اور بربادی کے ایسے سائنسی طریقے نکلے تھے جو سارے انسانی سماج کو برباد کردیں اور نہ گاندھی جی کی زندگی کے سرگرم حصے میں اس قسم کے ہتھیاروں کا تصور کیا جا سکتا تھا۔

اسی زمانے میں گاندھی جی کی صحت خراب ہوگئی اور انہیں پیچش کی شکایت ہوگئی لیکن انہوں نے دوا کرنے سے انکار کردیا۔ انہیں دواؤں پر بھروسہ بالکل نہیں رہا تھا۔ انہوں نے قدرتی علاج کیا اور برف کی پٹی رکھنے سے انہیں فائدہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے بکری کا دودھ پینا شروع کردیا کیونکہ انہوں نے گائے کا دودھ نہ پینے کی قسم کھائی تھی۔ بکری کے دودھ سے بھی انہیں فائدہ ہوا اور وہ اچھے ہوگئے لیکن اب وہ پہلے کے مقابلے میں بہت دبلے ہوگئے تھے اور ان کے سر کے بال بھی جھڑنے لگے تھے۔

۱۹۱۹ء میں ایک نئی تحریک کی ضرورت محسوس ہونے لگی یہ تحریک رولٹ بل کے خلاف شروع کرنی تھی اس بل کو اسی نام کی ایک کمیٹی نے تیار کیا تھا ہندوستانی لیڈروں کی مخالفت کے باوجود اس نے قانون کی شکل اختیار کرلی۔

اس بل کا مقصد یہ تھا کہ سیاسی تشدد اور بغاوت کو روکا جائے اور مخصوص عدالتوں کے ذریعہ خفیہ طور پر مقدمات کی سنوائی ہو اور ان کے فیصلوں کے خلاف اپیل نہ ہو سکے اس بل میں نظر بندی کی بھی گنجائش تھی یعنی صرف شبہہ پر کسی شخص کو بھی گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی مقصد تھا کہ وہ لوگ جن سے یہ اندیشہ ہو کہ وہ کبھی جرم کر سکتے ہیں ان سے پہلے ہی ضمانت لے لی جائے۔ اور جن لوگوں کے پاس بغاوت کے سلسلے میں کوئی سامان نکلے انہیں سزا دے دی جائے۔ اس قانون کے ذریعہ ان لوگوں کو شہر بدر کیا جا سکتا تھا جن پر شبہہ ہو اسی کے ساتھ ایسے لوگوں کی جانب سے کوئی قدم اٹھانے پر پابندی بھی لگائی جا سکتی تھی۔

تمام ہندوستانی لیڈر اس قانون کے خلاف تھے ان کا کہنا تھا کہ یہ قانون جابرانہ اور

شہری حقوق کی پائمالی ہے۔

اس لیے گاندھی جی نے فیصلہ کیا کہ وہ اس قانون کے خلاف ستیہ گرہ کریں گے تاکہ اسے واپس لے لیا جائے انہوں نے تحریک شروع کر دی جو سات ہفتے تک چلتی رہی یہ اپنے ڈھنگ کی پہلی قومی تحریک تھی ستیہ گرہیوں نے عہد کیا کہ رولٹ ایکٹ اور کچھ دوسرے قانونوں کی پابندی نہیں کریں گے جو نمک ٹیکس اور اخباروں سے متعلق تھے۔

اس تحریک میں گاندھی جی نے ہندوستان کا دورہ کیا اور بمبئی میں ستیہ گرہ مجلس قائم کی وہیں سے تحریک کا انتظام ہوتا تھا اس مجلس نے تعمیری کام کے طریقے بھی سکھانے شروع کر دیئے اس طرح ستیہ گرہیوں کی ایک چھوٹی سی فوج تیار ہو گئی۔

اس کے بعد گاندھی جی نے پورے دن کی ہڑتال کی اپیل کی۔ ہڑتال کا پروگرام یہ تھا کہ سب لوگ اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کام بند کر دیں، برت رکھیں اور دعائیں کریں۔ تمام بازار اور کام کاج اس دن بند رہے۔ ۶ر اپریل ۱۹۱۹ء کو یہ ہڑتال ہوئی بمبئی میں بہت کامیاب رہی۔ یہاں حکومت کے خلاف کتابیں اور اخبار فروخت کیے گئے مگر غلطی سے یہ ہڑتال دہلی میں ایک ہفتے پہلے ۳۰ر مارچ ہی کو ہو گئی اور بمبئی کی طرح پرامن طریقہ پر نہیں ہوئی کیونکہ دونوں طرف سے کچھ تشدد کے واقعات ہو گئے دوسرے شہروں میں بھی تشدد سے کام لیا گیا یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ احتجاج کے اس نئے طریقے کے بارے میں گوروں کو بہت کم علم تھا کہیں کہیں پولیس کی زیادتی کی وجہ سے بھی ستیہ گرہی تشدد پر آمادہ ہو گئے۔ ستیہ گرہ کی یہ تحریک ناکام رہی۔ تب گاندھی جی نے دوسرا برت رکھنے کا اعلان کیا انہوں نے کہا کہ ستیہ گرہ کے بارے میں تیاری کے متعلق میرا جو اندازہ تھا وہ غلط نکلا اس لیے مجھے اپنے غلط اندازے پر سزا کے بطور برت رکھنا چاہیے برت تین دن تک رہا اس کے بعد تحریک واپس لے لی گئی۔

اس کے جلد ہی بعد تشدد کے اور زیادہ بھیانک واقعات ہوئے یہ واقعات ۱۰ر اور ۱۳ر اپریل کو پنجاب کے امرتسر نامی شہر میں ہوئے ۱۳ر تاریخ کو نہتے لوگوں کے ایک مجمع پر فوجی سپاہیوں نے گولی چلائی جس میں چار سو آدمی اسی جگہ مر گئے اور لگ بھگ تین گنے زخمی ہوئے برطانی فوجی لیڈروں کو یہ شبہہ ہو گیا تھا کہ سازش کی جا رہی ہے اور بغاوت ہونے والی ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں امرتسر میں کیے گئے قتل عام کی خبر ساری دنیا میں پھیل گئی اس سے برطانی حکومت بہت بدنام ہوئی کیونکہ بغاوت کا کوئی ثبوت کبھی مل ہی نہیں سکا رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کی بنا پر حکومت نے اسے کبھی

نافذ نہیں کیا اور نہ وہ رولٹ بل کو کبھی مجلس قانون ساز کے سامنے لائی مگر گاندھی جی کی نظر میں ستیہ گرہ تحریک ناکام رہی اس لیے نہیں کہ اس کا مقصد پورا نہیں ہوا بلکہ اس وجہ سے کہ بہت سے ستیہ گرہیوں کے ہاتھوں تشدد کے واقعات ہوئے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ عدم تشدد کی تحریک گاندھی جی کی ذاتی رہنمائی ہی میں پوری طرح قابو میں رہ سکتی ہے لیکن تمام عوام کو گاندھی جی کی ذاتی رہنمائی نہیں مل سکتی تھی اور کوئی دوسرے لوگ ایسے تھے نہیں جو مؤثر طریقے پر رہنمائی کر سکتے کبھی کبھی برطانی حکومت گاندھی جی کو ان جگہوں پر جانے سے روک دیتی تھی جہاں ان کی ضرورت تھی جیسے پنجاب اور دہلی اور انہی مقامات پر تحریک ناکام ہو گئی۔

اسی سال پنجاب کے برطانی حاکموں نے کچھ اور حرکتیں ایسی کیں جن سے ہندوستانی عوام کی بے عزتی ہوئی اس سے اور ناراضگی پھیلی امرتسر میں جس آدمی کے کہنے سے گولی چلائی گئی تھی اسی بریگیڈیر جنرل ریجنالڈ آئی، ایچ ڈائر نے یہ حکم جاری کیا کہ ایک سڑک پر جہاں ایک یورپی خاتون پر حملہ کیا گیا تھا وہاں ہندوستانی لوگ رینگ رینگ کر چلیں اسی کے ساتھ یہ بھی حکم تھا کہ جس راستے سے کوئی یورپی گذرے وہاں ہر ہندوستانی پیدل ہو یا سواری پر اتر کر باہر آئے اور جھک کر سلامی دے بہت لوگوں کی سواریاں چھین لی گئیں اور طالب علموں سے سخت گرمی میں دس دس میل لمبی مارچ کرائی گئی۔

گاندھی جی نے جنگ میں برطانی حکومت کی حمایت کی فوج میں بھرتی کرانے کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا لیکن جنگ کے بعد جلیان والا باغ وغیرہ کے واقعات کی بنا پر انگریزوں کے برتاؤ سے گاندھی جی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ۱۹۱۹ء کے آخر میں شہنشاہ جارج پنجم نے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور ہندوستانی اصلاحات قانون کے لیے منظوری دے دی اس پر تھوڑے عرصے کے لیے گاندھی جی کو انگریزوں پر پھر بھروسہ پیدا ہو گیا۔

لیکن یہ نئی وفاداری زیادہ عرصے تک نہیں قائم رہی ہندوستان کے انگریز حاکموں نے اصلاحات کو عملی جامہ نہیں پہنایا اور انگریز افسروں پر جو ظالمانہ رویئے کے ذمہ دار تھے الزام لگائے جانے یا سزا دینے کے بجائے ان کی ترقی کر دی گئی اور وہ بہادر قرار دے دیئے گئے اس سے برطانی حکومت پر گاندھی جی کو کوئی بھروسہ نہیں رہ گیا اور وہ اسے شیطانی حکومت کہنے لگے۔

۱۲۔ سابرمتی آشرم

گاندھی جی نے احمدآباد کی کوچ رب نامی بستی میں ایک آشرم یا روحانی مرکز کھولنے کا فیصلہ کیا مقصد یہ تھا کہ افریقہ میں فونکس فارم میں جو ہندوستانی بچے ان کے ساتھ رہتے تھے ان کے لیے ایک گھر کا سا کام دے اس کے علاوہ ان کے ساتھ کام کرنے والوں اور دوستوں کے بچے بھی اس میں رہیں۔

آگے چل کر سارے ملک میں یہ آشرم بہت اہم ثابت ہوا کیونکہ یہاں سے کھادی کا کام شروع ہوا۔ گاندھی جی نے فیصلہ کیا کہ لوگوں کو سوت کاتنے اور کپڑا بننے کا کام سکھانے کا تجربہ کیا جائے وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا ہندوستانی عوام کے لیے خالی وقت میں یہ کام فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہوسکتا ہے یا نہیں۔

انہوں نے اس کا ستیہ گرہ آشرم نام رکھا۔ اس کا کام پچیس ۲۵ آدمیوں سے شروع کیا گیا مگر کچھ ہی دنوں بعد طاعون پھیل جانے کی بنا پر مجبوراً اسے احمدآباد ہی میں سابرمتی کے کنارے لے جانا پڑا۔ اس کے پاس قریب قریب ڈیڑھ ایکڑ زمین ہوگئی رفتہ رفتہ کئی عمارتیں وہاں بن گئیں۔ رہنے کے مکان، ڈیری فارم، کتب خانہ، کھانے کا ہال وغیرہ کھیتی کے لیے زمین بھی بعد میں حاصل کرلی گئی۔

لوگوں نے گاندھی جی کو باپو یا باپو جی کے پیار بھرے نام سے پکارنا شروع کردیا۔ آشرم کے کاموں کی زیادہ تر ذمہ داری گاندھی جی کا چچیرے بھائی مگن لال گاندھی پر تھی وہ گاندھی جی کے خواب کو پورا کرنے کی پوری کوشش کرتے رہتے تھے۔ گاندھی جی کا اکثر وقت ملک کے دورے پر صرف ہوتا تھا اور انہوں نے آشرم کی بہت کچھ ذمہ داری مگن لال پر چھوڑ دی۔

ایک دن گاندھی جی نے طے کیا کہ آشرم میں باپ، ماں اور بیٹی پر مشتمل ایک ہریجن خاندان کو آشرم میں داخل کرلینا چاہیئے۔ احمدآباد میں رہنے والے دوستوں اور آشرم کے کچھ ممبروں نے اس خیال کی مخالفت کی۔ اس لیے گاندھی جی نے اعلان کردیا کہ وہ احمدآباد کے اچھوتوں کے درمیان جاکر رہیں گے اور ان کے ساتھ محنت مزدوری کا کام کریں گے۔

جنہیں اچھوت کہا جاتا ہے وہ ہندوستان کی چار خاص ذاتوں میں نہیں آتے ہیں۔ وہ ان کے باہر مانے جاتے ہیں اور نیچ کام کرتے ہیں جیسے صفائی اور میلا اٹھانا گاندھی جی اور دوسرے سمجھدار لیڈر چھوت چھات سے بہت نفرت کرتے تھے اور اب تو ہندوستان کے دستور میں اس پر روک لگا دی گئی ہے۔

ظاہر ہے چھوت چھات جیسا رواج گاندھی جی برداشت نہیں کر سکتے تھے انہوں نے اچھوتوں کو ہریجن کہنا شروع کیا اور بعد میں ہریجن نام کا ایک مشہور ہفتہ وار رسالہ نکالا اس میں انہوں نے ایک بار لکھا کہ صفائی ستھرائی کے ساتھ رہنے والے کسی شخص کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں پرہیز نہ کرنا چاہیے۔

اپنے ایک جلسے میں انہوں نے کہا تھا کہ " میں کوئی افسر یا سردار نہیں ہوں میں تو ایک مہتر، سوت کاتنے والا بنکر اور مزدور ہوں اور اگر میری عزت کی جاتی ہے تو اسی ناتے کی جانی چاہیے۔" وہ چھوت چھات کے قطعی خلاف تھے۔

اس لیے احمدآباد کے اچھوتوں کے ساتھ رہ کر مزدوری کرنے کا ان کا فیصلہ کسی طرح انوکھا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ ایسا نہ کر سکے۔ اسی درمیان احمدآباد کے ایک خوش حال مسلمان تاجر نے آشرم کو تیرہ ہزار روپئے کی امداد دی جس کی وجہ سے وہ کمی پوری ہوگئی جو ہریجن خاندان کو آشرم میں رکھنے کی بنا پر آشرم کے اندر اور باہر سے ملنے والی رقم بند ہو جانے سے ہوگئی تھی۔

کستور بائی تک نے ہریجن خاندان کو آشرم میں رکھنے کی مخالفت کی کیونکہ وہ تو ایک کٹر ہندو خاتون تھیں گاندھی جی نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی مگر انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا عقیدہ ایسا گہرا ہے کہ اس سے ہٹانا مشکل ہوگا۔ گاندھی جی نے ان سے کہا کہ یا تو وہ ہریجن خاندان کو آشرم میں رکھنا گوارہ کرلیں یا پھر پوربندر چلی جائیں اس کے بعد کستور بائی ہریجن خاندان کو رکھنے پر راضی ہوگئیں کیونکہ وہ شوہر کی وفادار ایک ہندو خاتون تھیں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہوا کہ اپنے شوہر کے اصولوں پر ان کی حیرت تیزی سے کم ہوتی گئی اور وہ ان کے فیصلوں کا احترام کرنے لگیں۔ جس ہریجن خاندان کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا تھا اس کے افراد یہ لوگ تھے :- ایک تھے دودا بھائی جو بمبئی میں اپنے مصیبت زدہ اچھوت بھائیوں کی خاطر ایک اسکول میں پہلے ٹیچری کرتے تھے دوسری ان کی بیوی دانی بہن اور تیسری ان

کی چھوٹی سی لڑکی لکشمی تھی بعد میں گاندھی جی نے لکشمی کو گود لے کر اپنی بیٹی بنالیا۔ مگر بہت سے ایسے ہریجن تھے جنہوں نے گاندھی جی کے اس نقطہ نظر کو پسند نہیں کیا۔

ستیہ گرہ آشرم کے کچھ اصول تھے جو گاندھی جی نے بنائے تھے۔ کسی بھی سماجی ادارے کے لیے جو عوام کا تعاون حاصل کرنے اور اچھی طرح چلنے کی امید رکھتا ہو کچھ قاعدے قانون ضروری ہیں۔ آشرم کے اصول اور طریقے اس ڈھنگ کے تھے جو ہندوستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کے لیے تو قابل عمل تھے اور اب بھی ہیں لیکن امریکا اور انگلستان جیسے کافی ترقی یافتہ اور صنعتی ملکوں میں ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس وقت ہندوستان میں ایک بیرونی حکومت قائم تھی ذات پات کا فرق آج کے مقابلہ میں اس وقت زیادہ تھا اور پڑھے لکھے لوگ محنت مزدوری کرنے میں ہیٹی محسوس کرتے تھے وہ خود کو ان کاموں سے بلند بالا سمجھتے تھے۔

آشرم کے لوگوں کے لیے ان باتوں کی پابندی ضروری تھی :-

سچائی، اہنسا (عدم تشدد) برہمچاریہ، میل محبت، جسمانی محنت، بے خوفی، پیسہ جمع نہ کرنا، چوری نہ کرنا، ترک لذت، مکمل مذہبیت، مساوات، سودیشی۔

آشرم میں لوگ اپنا کام خود کرتے اور محتاط زندگی بسر کرتے تھے۔ نوجوانوں کو اخلاق، روحانیت، ضبطِ نفس اور خواہش پر قابو رکھنے کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ اچھے ستیہ گرہی بن سکیں۔

گاندھی جی کی یہ عادت نہیں تھی کہ دوسرے سے کوئی ایسا کام کرنے کو کہتے جسے وہ خود کرنے کو تیار نہ ہوتے مثال کے طور پر وہ صفائی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ ہر جگہ اس کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ وہ خود پائخانہ صاف کرتے اور اس طرح دوسروں کے سامنے ایک اچھی مثال پیش کرتے تھے وہ گھروں میں جاکر دیکھتے اور غریب امیر سبھی لوگوں سے اپیل کرتے کہ وہ صفائی کی اہمیت محسوس کریں۔

کستوربا کو ان باتوں سے دکھ ہوتا تھا بالکل اسی طرح جس طرح اچھوت خاندان کو آشرم میں رکھنے سے ہوا تھا انہیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی کہ گندہ کام کرنے کے لیے گاندھی جی خود تیار ہو جاتے تھے۔ اس کے برعکس گاندھی جی کی خواہش تھی کہ پائخانہ صاف کرنے کے کام میں کستوربا ان کا ہاتھ بٹائیں۔

کموڈ کے برتن کی صفائی کستور با کرتی تھیں لیکن وہ جس ڈھنگ سے کرتی تھیں اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کام کو بری نظر سے دیکھتی ہیں گاندھی جی چاہتے تھے کہ وہ یہ کام خوشی خوشی کریں۔

کستور با نے ایک مرتبہ کہا کہ "اپنے گھر میں میں یہ واہیات باتیں برداشت نہیں کر سکتی"، گاندھی جی ویسے کافی نرم مزاج اور برداشت کرنے والے آدمی تھے لیکن یہ سن کر وہ اچانک آپے سے باہر ہو گئے انہوں نے با کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتے ہوئے دروازے تک لے گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہیں آشرم سے باہر نکال دیں گے۔ کستور با رونے لگیں۔ انہوں نے کہا کہ "تم میں کوئی شرم نہیں رہ گئی ہے؟" میں اس عمر میں کہاں جاؤں گی؟ میرے کون ماں باپ یا ناتے دار بیٹھے ہیں جو مجھے پناہ دیں گے؟ خدا کے لیے ہوش میں آکر کام کرو اور دروازہ بند کرو"

اس واقعے کے بعد کستور بائی صفائی کے کام میں گاندھی جی کی پوری مدد کرنے لگیں۔ آشرم کے تمام اصولوں کی وہ بڑی مستعدی سے پابندی کرتی تھیں۔

نیچ کام خود کرنے کے لیے تیار ہو کر گاندھی جی نے چھوت چھات ختم کرنے میں نمایاں کام انجام دیا اور یہ ان کا ایک کارنامہ سمجھا جانا چاہیے انہیں یہ طریقہ بالکل پسند نہیں تھا کہ ایک ہی گروہ کے لوگ ہمیشہ نیچ کام کرتے رہیں۔ اس لیے آشرم میں رہنے والے سبھی لوگ اس کام کو باری باری کرتے تھے انہیں گاندھی جی یہ سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ سماجی نقطۂ نظر سے ان کا یہ کام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اس کام کو ٹھیک ڈھنگ سے کیے جانے کے لیے کام کی نگرانی بھی کیا کرتے تھے۔

کستور بائی کے اختلاف سے پیدا ہونے والی دشواری ان کے رضامند ہو جانے کے بعد اگرچہ دور ہو گئی لیکن اس کے باوجود آشرم میں سب کام بالکل ٹھیک طرح نہیں چل رہے تھے کیونکہ میرا بہن کو وہ یکانگت وہاں نہ مل سکی جس کی امید لے کر وہ وہاں آئی تھیں نیچ بات تو یہ ہے کہ گاندھی جی کے ماننے والوں میں کچھ ہی ایسے لوگ تھے جو بے لوث ہوں اور اپنے اصولوں کو سچائی کے ساتھ مانتے ہوں۔ مردوں کے لیے آشرم میں شامل ہونے کی کئی وجہیں ہو سکتی تھیں لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وجہیں ہمیشہ قابل تعریف ہوتی تھیں مردوں کے ساتھ آشرم میں آنے والی ان کی بیویاں اکثر اپنے شوہروں کے خیالات سے

متفق نہ ہوتی تھیں رہے بچے تو ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ آشرم کے غیر معمولی فلسفہ زندگی اور وہاں کے اصولوں اور قاعدوں پر عمل کر سکیں گے۔

گاندھی جی کو ان سب باتوں کا علم تھا لیکن وہ اسی طرح کام چلا رہے تھے کیونکہ وہ یہ پسند نہ کرتے تھے کہ صرف ایک خاص طرح کے لوگوں کو ساتھ رکھ کر آشرم چلایا جائے ان کا خیال تھا کہ سماجی اصولوں کے تجربے کے لیے عام آدمی زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جتنی دشواریاں ان کے سامنے آتی تھیں اتنا ہی ان کے اندر کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

اگرچہ وہ نرم مزاج اور محبت کرنے والے تھے لیکن وہ نظم و ضبط کی پابندی ضروری سمجھتے تھے اور کافی اصولی آدمی تھے وہ اخلاق و عادات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ لگاتار باپو آشرم میں رہے قیام کے دوران انہیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ جس حسن اخلاق کی وہ امید کرتے ہیں اس کی پابندی ان کی بیوی تک نہیں کرتیں اس پر انہوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار میں "میرا دکھ میری لجا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے اپنی ندامت کے تین سبب بتائے :-

" چھگن لال گاندھی کو میں نے اپنے لڑکے کی طرح پالا ہے اور بچپن سے اپنے ساتھ رکھا ہے لیکن وہ کئی مرتبہ غبن کرتے پکڑا گیا اگر اس نے کھلم کھلا اپنا جرم قبول کر لیا ہوتا تو میرا دکھ بہت کم ہو جاتا "

چھگن لال باپو کے بھتیجے تھے اور اپنے ساتھ آشرم میں کچھ نجی پیسہ لے گئے تھے آشرم میں نجی پیسہ اور ذاتی جائداد نہیں رکھی جاسکتی تھی اس لیے انہوں نے آشرم میں جمع کرا دیا تھا۔ جب وہ آشرم سے اپنی بیوی اور لڑکیوں کے ساتھ جانے لگے تو وہ پیسہ آشرم میں چھوڑ کر چلے گئے۔

ندامت والا دوسرا کام وہ تھا جو کستوربا نے کیا تھا۔ گاندھی جی ان کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے لیکن انہوں نے کہا کہ آشرم میں رہنے کی شرط یہ تھی کہ پیسہ یا زیور جیسی کوئی ذاتی چیز کسی کے پاس نہیں رہے گی لیکن کستوربائی نے اس پر دھیان نہیں دیا اور مختلف موقعوں پر مختلف لوگوں نے انہیں جو سو دو سو روپئے دیئے تھے وہ اپنے پاس رکھ لیے اس کے بعد اس پر کستوربائی نے افسوس ظاہر کیا اور نیا عہد کیا کہ آئندہ آشرم کے تمام قاعدوں

کی پوری پوری پابندی کریں گی۔
تیسری بات برہمچاریہ سے متعلق تھی۔ گاندھی جی نے لکھا :-
"تین سال پہلے مندر میں ایک بیوہ رہتی تھی ہم سب کا خیال تھا کہ اس کا اخلاق اچھا ہے اسی زمانے میں ایک نوجوان بھی وہاں ٹھہرا ہوا تھا جس کی پرورش ایک یتیم خانے میں ہوئی تھی ہم اسے بھی ایک اچھا آدمی سمجھتے تھے، وہ غیر شادی شدہ تھا لیکن اس نے بیوہ سے ناجائز تعلقات قایم کرلیے یہ معاملہ اگرچہ پرانا ہوگیا ہے لیکن یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ایک ایسے آشرم میں جہاں برہمچاریہ کے لیے ہر قسم کی کوشش کی جارہی ہو وہاں یہ ناپاک کام ہو"
گاندھی جی کو دوسروں کے عیب نکالنے اور ان کی بدگوئی کرنے میں کوئی مزا نہیں آتا تھا کیونکہ اسی مضمون میں انہوں نے کہا۔ "پڑھنے والوں سے میری یہ التجا ہے کہ وہ میری اس بات پر اعتبار کریں کہ یہ سب افسوسناک واقعات میری خامیوں کا مظہر ہیں اوپر میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میں اچھا ہوں اور میرے ساتھی برے ہیں بلکہ میرا خیال پختہ ہے کہ بہت سی کمزوریاں جو میرے اندر پائی جاتی ہیں وہ پھوڑا بن کر باہر آجاتی ہیں میں نے بالکل پاک صاف ہونے کا کبھی دعوا نہیں کیا آشرم میں ہونے والے گناہ خود میرے گناہوں کی صدائے بازگشت ہیں"
اگرچہ گاندھی جی اپنے کو برا اور گناہ گار سمجھتے تھے لیکن دوسرے ان کو ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ عوام کی بھلائی والے ان کے کاموں کی بنا پر انہیں اب تک بہت سے اعزاز مل چکے تھے۔

۱۳- باغی

گاندھی جی نے ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کے وائسرائے کو ایک خط بھیجا جس میں وہ سب اعزاز واپس کر دیے جو ان کو افریقہ میں ملے تھے۔ انہوں نے لکھا کہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ جس حکومت نے مجھے یہ اعزاز اور خطاب دیے تھے اس کے لیے میرے دل میں اب کوئی عزت باقی نہیں رہی ہے۔

اس سال سے انگریز حاکموں پر انہیں کوئی بھروسہ نہیں رہ گیا تھا اسی طرح حکومت کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ گاندھی ایک باغی ہے جس سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے حکمرانوں اور ہندوستانی لیڈروں میں کشمکش بڑھی اور کافی تناؤ پیدا ہو گیا۔ حاکموں کو پریشانی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ تحریک عدم تعاون بڑھ رہی تھی اور طاقتور ہو رہی تھی وہ آپس میں صلاح ومشورہ کرنے لگے کہ گاندھی کو باہر بھیج دیں یا اس پر مقدمہ چلائیں چنانچہ ان کی نقل وحرکت پر پابندی کے احکام جاری کر دیئے گئے۔

گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں کو امید تھی کہ انگریز جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دے دیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گاندھی جی کا یہ بھی خیال تھا کہ انگریز ہندوستان کے ساتھ سماجی، سیاسی اور اقتصادی ناانصافی کرنے کے بھی مجرم ہیں دوسری طرف انگریز نہ تو ان کے اصولوں اور طریقوں کو سمجھ سکے اور نہ ان سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ سمجھ سکیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان طریقوں کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں سے بھی کچھ نے گاندھی جی کی مخالفت کی جیسے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور اور مسلم لیڈر محمد علی جناح جن کے بارے میں آگے تفصیل سے ذکر ہوگا۔ ان کے علاوہ روحانیت پسند انگریز خاتون اینی بسنٹ جو ہندوستان میں حصول تحریک کی رہنمائی کر رہی تھیں انہوں نے بھی ان طریقوں کی مخالفت کی۔

گاندھی جی میں ہمت، تخیّل اور تنظیم تینوں چیزیں حیرت انگیز طور پر ایک جگہ اس طرح جمع ہو گئی تھیں جو کسی ایک لیڈر میں مشکل سے ملتی ہیں۔ انہوں نے اب عدم تعاون تحریک کے ایک جز کے طور پر حکومت کی امداد سے چلنے والے یا حکومت کی جانب سے چلائے جانے والے اسکولوں عدالتوں اور بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کی اپیل۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ موجودہ سکولوں کے بجائے ایسے اسکول چلائے جائیں جن میں ذریعہ تعلیم ہندوستانی زبانیں ہوں

اسی طرح انہوں نے انصاف کے لیے پنچ فیصلہ بورڈ قایم کرنے کی مانگ کی۔ انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ سوت کاتیں اور ہتھ کرگھے پر بن کر کپڑا تیار کریں (ایسے کپڑے کا نام انہوں نے کھادی رکھا)

بہت سے لوگ اس وقت سوچتے تھے اور اب بھی سوچتے ہیں کہ گاندھی جی مشینوں کے استعمال کے خلاف تھے حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ انہوں نے ایک مرتبہ ایک طالب علم سے کہا کہ "یہ جسم بھی تو کافی نازک مشین ہے، سوت کاتنے والا چرخہ خود ایک مشین ہے میں مشینوں کے خلاف نہیں ہوں، مشینوں کے لیے دیوانگی کے خلاف ہوں" ان سے ہندوستان میں بے روزگاری پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مشینوں کی مدد سے چند آدمی لاکھوں کروڑوں انسانوں پر سوار ہو کر لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں۔ اس نوجوان سے باتیں کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ سائنسی انکشاف اور تحقیقات منافع کمانے کا ذریعہ بن کر نہ رہ جائیں۔ میرا مقصد مشینوں کو مٹانا نہیں انہیں محدود کر دینا ہے۔ میں سب سے زیادہ اہمیت تو انسان کو دیتا ہے "

ان سب باتوں میں انہوں نے اہنسا کا طریقہ استعمال کرنے پر زور دیا ان کا اصرار تھا کہ انگریز ہو یا کوئی اور کسی کے لیے ہمارے دل میں نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ملک میں تین چیزوں نے بیرونی حکومت کو طاقتور بنایا وہ ہیں تشدد، اتحاد کا نہ ہونا اور ہندوستانیوں میں خراب بن جانے کی اہلیت اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ یہاں کے لوگ نشیلی چیزیں استعمال کرنا چھوڑ دیں، چھوت چھات کا رواج ختم کر دیں اپنے ہم مذہبوں کی آنکھ بند کر کے حمایت کرنا بند کر دیں۔ جنھیں وہ سماجی برائیاں سمجھتے تھے ان کے متعلق عوام بھی اپنا نقطہ نظر بدل دیں مثال کے طور پر ہاتھ سے کام کرنے کو ذلت سمجھنا۔ وہ چاہتے تھے لوگ خود کپڑا تیار کریں۔ گاندھی جی ہٹ دھرم، ناسمجھ اور ضدی آدمی نہیں تھے میرا بہن نے پاگل کتوں کے بارے میں جو بات بتائی اس سے گاندھی کے کھلے دماغ کا پتہ چلتا ہے۔

سابرمتی آشرم میں سڑک کے کتے ایک مسئلہ بنتے جا رہے تھے ان میں پاگل پن کے آثار نظر آنے لگے تھے جس علاقے میں آشرم واقع تھا وہاں کے ہندو لوگ ان پاگل کتوں کو مار ڈالنے کے خلاف تھے گاندھی جی کی صلاح لی گئی تو انہوں نے انہیں مار دینے کی حمایت کی دیکھنے میں تو یہ بات بے جوڑ معلوم ہوتی تھی لیکن گاندھی جی کے اس خیال کو اگر دھیان میں رکھا جائے تو

بات سمجھ آجاتی ہے کہ "سب سے زیادہ اہمیت انسان کو دینا چاہیے"
اس کے علاوہ ایک اور معاملہ اٹھا وہ آشرم کی بیمار، لاچار بچھیا کا وہ بیمار تھی مکھیاں اسے ستا رہی تھیں وہ نہ مرتی تھی نہ اچھی ہوتی تھی گاندھی جی نے طے کیا کہ اسے اس طرح ختم کر دیا جائے کہ اسے کم سے کم تکلیف پہونچے لیکن آشرم کے کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی مخالفت کرنے والوں میں کستوربائی بھی تھیں تب گاندھی جی نے با (کستوربائی کو محبت میں کہا جاتا تھا) سے اور ان کی قریبی سہیلی کاشی بہن سے کہا کہ وہ بچھیا کی دیکھ بھال کریں جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ بچھیا کی آرام کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ وہ اسے انجکشن دلانے کے لیے راضی ہو گئیں اس طرح بچھیا مر گئی اور اس کی تکلیف دور ہو گئی۔ جب گاندھی جی نے اس واقعہ کے بارے میں اپنے ہفتہ وار اخبار نوجیون میں لکھا تو لوگوں نے انہیں غصّے سے بھرے خط لکھے لیکن لوگوں کی نکتہ چینی کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔
لوگ ان کے خیالات سے اختلاف تو کرتے تھے لیکن ان کی باتوں کو دھیان سے سنتے تھے کیونکہ وہ ۱۹۲۱ء سے ہی اپنے صوفیانہ رجحان کے لیے مشہور ہو چکے تھے اب وہ صاف ستھری غریبوں جیسی زندگی بسر کرنے کے عہد پر سختی سے عمل کر رہے تھے۔ رہن سہن کے ان کے سادہ اور آسان طریقوں کو اونچے درجے کی باتیں کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا لاکھوں کروڑوں انسانوں کی نگاہ میں وہ اوتار (برگزیدہ) کی حیثیت رکھتے تھے ان کے ساتھ لوگوں کی عقیدت اور احترام بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کی وجہ سے انہیں کچھ پریشانی بھی ہوتی تھی اور کبھی کبھی وہ خفا ہو جاتے تھے وہ سوچتے تھے کہ میرے نام کے نعرے لگانے اور درشن کے لیے دھکم دھکا میں جو طاقت صرف ہوتی ہے اگر اسے آزادی دلوانے والے کام میں استعمال کیا جائے تو زیادہ اچھا ہو۔
وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے نام کا کوئی نیا مذہب یا حلقہ بنایا جائے یا جیسا کسی نے کہا ہے کہ "اپنے لیے وہ کوئی مندر نہیں چاہتے تھے" انہوں نے جو کچھ کہا یا کیا اس کی بنیاد پر کوئی فرقہ بنانے کی انہوں نے ہمیشہ مذمت کی اور 'گاندھی واد' کے نام کی کوئی چیز وہ پسند نہ کرتے تھے۔ ان کے بارے میں ایک قصّہ مشہور ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جب وہ گجرات کے کراڑی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بانس کی ایک جھونپڑی میں ٹھہرے ہوئے تھے تو گاؤں کے لوگ آکر جمع ہو گئے۔ وہ ایک جلوس کی شکل میں آئے تھے آگے آگے گاؤں کے لوگ تھے اس

کے بعد اور دوسرے لوگ اور آخر میں بینڈ باجا تھا وہ اپنے ہاتھوں میں پھل پھول اور شہد لیے ہوئے تھے انہوں نے یہ سب چیزیں گاندھی جی کو پیش کر دیں۔

گاؤں کے مکھیا نے کہا " بہت دنوں سے ہمارے گاؤں کے کنوئیں میں پانی نہیں آرہا تھا کل آپ کے پاک قدم جیسے ہی ہمارے گاؤں کی زمین کو لگے ویسے ہی ان کی برکت سے ایسا معجزہ ہوا کہ آج کنوئیں میں پانی اوپر تک بھرا ہے ہماری آپ سے درخواست ہے کہ ..."

گاندھی جی نے غصے میں آکر بیچ ہی میں ان کی بات کاٹ دی ...

" آپ سب بیوقوف ہیں جو کچھ ہوا وہ میری وجہ سے نہیں ہوا بلکہ اتفاق سے ہوگیا۔ خدا کے اوپر جتنا آپ کا اثر ہے اس سے زیادہ میرا نہیں ہے "

اس کے بعد انہوں نے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا کہ " یہ کوئی جادو نہیں تھا۔ مان لو کہ تاڑ کے پیڑ پر کوئی کوا آکر بیٹھے اور اس کے بیٹھتے ہی پیڑ دھڑام سے گر پڑے تو کیا تم یہ کہو گے کہ کوے کی وجہ سے وہ پیڑ گر گیا ؟ "

جلوس میں آنے والے لوگوں کو گاندھی جی نے صلاح دی " جاؤ اپنے گھر جاؤ مادر ہند کے ننگے جسم کو ڈھکنے کے لیے سوت کاتنے اور بننے میں اپنا وقت صرف کرو۔ چرخہ چلاؤ اور کھادی پہنو "

ایسی انوکھی قیادت میں تحریک عدم تعاون بڑھ رہی تھی لیکن ایسا صرف کچھ ہی جگہوں پر ہو پایا تھا اور تحریک بڑھ کر ابھی قومی پیمانے پر نہیں پہونچی تھی۔

ایک سال کے اندر سوراج حاصل کرنے کی امید میں گاندھی جی ان تھک کوشش کر رہے تھے وہ روزانہ صرف چار پانچ گھنٹے سوتے تھے لگاتار کام کرتے رہتے ان کے پاس اتنے خط آتے تھے کہ ان کے جواب لکھنے کے لیے کئی سکریٹریوں سے مدد لینی پڑتی تھی اپنے اخبار " نوجیون " (انگریزی میں ینگ انڈیا) کے لیے بھی وہ برابر لکھا کرتے تھے۔ حکومت گاندھی جی کے بارے میں اپنی پالیسی طے کر چکی تھی وہ اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ انہیں جیل شہید بنانے کے بجائے انہیں گرفتار نہ کرنا ہی زیادہ مفید ہوگا۔ سچ بات یہ ہے کہ نئے وائسرائے لارڈ ایڈنگ نے صورت حال کو نئے نقطہ نظر سے دیکھا۔ ۱۹۲۱ء میں موجودہ مسائل پر بات چیت کرنے کے لیے گاندھی جی سے چھ بار ملاقات کی۔

وائسرائے گاندھی جی سے کافی متاثر تھا لیکن وہ ان کے سیاسی نقطہ نظر اور اصول نہیں

سمجھ پارہا تھا لیکن جیسے جیسے کانگرس آزادی کی تحریک میں آگے بڑھتی گئی اچھے برتاؤ کا یہ رویہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا ۱۹۲۱ء کے ختم ہوتے ہوتے حکومت نے بڑے زوروں سے کانگرس کے خلاف کاروائی شروع کر دی۔

'تعزیرات ہند' قانون کے ماتحت لگ بھگ تیس ہزار آدمی گرفتار کیے گئے سویم سیوک (رضا کار) تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی، جلسے، جلوس روک دیے گئے اور کانگرس کے دفتروں کی تلاشی لی گئی۔ اس وقت تک گاندھی جی کانگرس کے صدر بن چکے تھے اور ان کے ہاتھ میں تمام اختیارات تھے کہ جس طرح چاہیں تحریک چلائیں اس وقت وہ پوری طرح سول نافرمانی کی تحریک نہیں چلا رہے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں وہ قابو سے باہر نہ ہو جائے انہوں نے حکومت کو آگاہی دی کہ بڑے پیمانے پر گرفتاریوں اور کانگرس کے لوگوں پر مظالم کی وجہ سے لیڈروں کے لیے سول نافرمانی کرنا ضروری ہو جائے گا۔

ایک جگہ مشتعل مجمع اور پولیس میں مدبھیڑ ہو جانے سے ایسی زبردست بے چینی اور بد نظمی پیدا ہوئی کہ اسے ہندوستانی تاریخ میں ایک اہم جگہ مل گئی یہ واقعہ یکم فروری ۱۹۲۲ء کو ہوا۔ اور جہاں یہ واقعہ ہوا وہ اتر پردیش کے ضلع گورکھپور کا ایک گاؤں چوری چورا تھا۔ وہاں ایک جلوس نکلا جس پر وہاں کے حکام نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جلوس کے بعد جب لوگ ادھر ادھر جانے لگے تو پولیس نے کچھ لوگوں کو ستانا شروع کیا اس پر ان لوگوں نے مدد کے لیے شور مچایا لوگ ان کی آواز سن کر لوٹ پڑے جب وہ لوٹے تو پولیس نے ان پر گولی چلا دی۔

کارتوس کم ہو جانے کی بنا پر پولیس پناہ کے لیے پاس کی ایک عمارت میں چھپ گئی تب مجمع نے اس عمارت میں آگ لگا دی اور چھپے ہوئے سپاہی نکل کر بھاگنے کے لیے مجبور ہو گئے جب وہ باہر آئے تو لوگوں نے انہیں مار ڈالا اور ان کی لاشوں کو آگ میں پھینک دیا۔ اس ہنگامے میں بائیس سپاہی مارے گئے۔

اس زیادتی سے گاندھی جی کو بڑا دکھ ہوا اور انہوں نے تحریک عدم تعاون واپس لے لی۔ کانگرس نے چوری چورا کے واقعہ پر ایک تجویز منظور کر کے افسوس ظاہر کیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسری تجویز کے ذریعہ اپنی دوسری سرگرمیاں بھی کم کر دیں۔

گاندھی جی کے اس اقدام کی ان کے کچھ ساتھیوں نے ہی مخالفت کی۔ جیسے سبھاش چندر

بوس، موتی لال نہرو اور لاجپت رائے ، موتی لال اور لالہ جی نے تو اپنی مخالفت کا اظہار جیل سے خط کے ذریعہ کیا۔ ان کے علاوہ اور دوسرے چھوٹے لیڈروں نے بھی اس کی مخالفت کی ۔

تحریک خلافت میں شامل مسلمان لیڈروں نے بھی گاندھی جی کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا ۔ خلافت کے لوگ گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون میں اس لیے شامل ہو گئے تھے کہ ترکی کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کو جو یقین دہانی کرائی گئی تھی اسے حکومت نے پورا نہیں کیا تھا ۔

تحریک واپس لینے کا مطلب انگریز یہ سمجھے کہ گاندھی جی یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کا سارا پروگرام ناکام ہو رہا ہے اور چوری چورا کے واقعہ کو محض ایک بہانہ بنایا گیا ہے حکومت یہ نہ سوچ سکی کہ جو ظلم ہندوستانی مجمع نے کیا تھا وہ گاندھی جی کے اصول کے خلاف تھا دوسرے اسے تحریک عدم تعاون کا جز نہیں کہا جا سکتا تھا ۔

گاندھی جی کی نگاہ میں چوری چورا کے واقعہ کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس کے اندر بہت سے لوگ ستیہ گرہ کو سمجھے ہی نہیں ہیں ۔ جب ملک میں بڑے پیمانے پر تشدد کے اُبھر آنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں تحریک عدم تعاون نہیں چلائی جا سکتی ۔

گاندھی جی کا یہ پختہ خیال تھا کہ عدم تشدد کا قائل (یعنی ستیہ گرہی) آدمی عدم تعاون اس وقت تک کر ہی نہیں سکتا جب تک اس نے خوشی سے اور ایمانداری کے ساتھ حکومت کے قانون کی پہلے پابندی نہ کی ہو ۔ ان کا کہنا تھا کہ ستیہ گرہیوں کو چاہیے کہ امن اور شانتی لانے اور بدنظمی روکنے کے لیے وہ حاکموں کی برابر مدد کریں ۔ گاندھی جی اہنسا (تشدد) کے خلاف برابر بولتے رہتے اور حکومت کی ایسی کارروائیوں کی مخالفت کرتے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کوئی انتظام اور کوئی قاعدہ قانون ہی باقی نہ رہے وہ نراج نہیں چاہتے تھے ۔

اس واقعہ کے ایک سال پہلے ایک موقعے پر جب کچھ ستیہ گرہیوں نے اپنے عہد کی ہی پابندی نہیں کی تو گاندھی جی نے کہا تھا " ان دنوں جس سوراج کو میں نے دیکھا ہے اس کی بدبو میرے نتھنوں میں بھر گئی ہے "

چوری چورا کے بعد کسی طرح امن ہو گیا لیکن اس کے باوجود گاندھی جی کو ۱۰ ر مارچ سنہ ۱۹۲۲ء کو گرفتار کر لیا گیا ۔ اور آٹھ دن کے بعد ان کے خلاف احمد آباد میں مقدمہ چلایا گیا ۔ مقدمے کے دوران انہوں نے جو کہا اسے ان کی مشہور ترین تقریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔

۱۴- جیل کا سفر

حکومت نے گاندھی جی کے خلاف ان تین مضامین کے سلسلے میں مقدمہ چلایا جو انہوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار 'نوجیون' میں لکھے تھے گاندھی جی نے اور اخبار کے ناشر شنکر لال نے اپنی کوئی صفائی پیش نہیں کی اور گاندھی جی نے اپنا جرم تسلیم کرلیا۔

انہوں نے عدالت میں جو بیان دیا اس میں انہوں نے تفصیل سے اس تبدیلی کا ذکر کیا جو اس عرصے میں ان کے اندر ہوئی ... انہوں نے بتایا کہ ایک زمانے میں وہ اپنے کو برطانوی حکومت کی وفادار رعایا سمجھتے تھے اس کے بعد رفتہ رفتہ ایسے حالات ہوئے کہ وہ حکومت کے پکّے باغی ہوگئے انہوں نے اس بات پر بڑے رنج کا اظہار کیا کہ انگلستان نے ہندوستان کو بہت بری طرح نچوڑا اور اس کے رہنے والوں کے ساتھ ظلم کیا حال میں جو واقعات ہوئے اس کا الزام انہوں نے اپنے سر لے لیا۔

انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ عدالت سے کہا " جج صاحب! آپ کے سامنے دو راستوں میں سے ایک ہی راستہ کھلا ہے وہ یہ کہ یا تو آپ اپنے عہدے سے استعفا دے دیں یا اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جس قانون اور قاعدے کے چلانے میں آپ مدد کر رہے ہیں وہ جنتا کے مفاد میں ہے تو آپ مجھے سخت سے سخت سزا دیجئے۔"

انہیں چھ سال کی سزا دی گئی۔ گاندھی جی نے کہا یہ تو بہت کم ہے اور پھر جج کی عنایت کا شکریہ ادا کیا۔ پورا مقدمہ پونے دو گھنٹے کے اندر ختم ہوگیا۔ گاندھی جی شنکر لال بینکر کے ساتھ پونا کے پاس بردوا جیل لائے گئے ان پر کئی طرح کی پابندیاں لگائی گئیں ساتھ ہی ساتھ وہ کسی دوسرے قیدی سے مل بھی نہیں سکتے تھے۔ انہیں تکیہ رکھنے کی اجازت نہیں تھی انہیں چاقو صرف کھانے کے وقت دیا جاتا تھا۔

کچھ دنوں بعد انہیں چرخہ چلانے کی اجازت دے دی گئی وہ روز چرخہ چلاتے اور صبح شام عبادت کرتے تھے۔ انہیں پڑھنے کی عادت پہلے سی تھی اب یہاں اور زیادہ پڑھنے لگے تھے۔ انہوں نے جن مصنفوں کی کتابیں بردوا جیل میں پڑھیں ان کے نام یہ ہیں :- امریکی فلسفی ولیم جیمس برطانی ناول نگار ہربرٹ جارج ویلس، آئرلینڈ کے ڈرامہ نویس، ناول نگار اور مضمون نگار جارج برناڈ شا۔ سامراجیت کا برطانوی پجاری جس نے ہندوستان کے متعلق کہانیوں اور

ناولوں میں بہت کچھ لکھا ہے رڈیارڈ کپلنگ اور جرمن ڈرامہ نویس اور ناول نگار جان ولف گانگ گوئٹے۔ گاندھی جی جیل میں مارچ ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۴ء تک رہے۔ جیل میں وہ بیمار پڑ گئے کچھ دنوں کے بعد جب اچھے ہو گئے تب بھی ان کے مسوڑوں سے خون نکلتا رہا۔ اس کے علاوہ اور کچھ شکائتیں بھی رہیں۔ جیل میں گاندھی جی کی خدمت کے لیے ایک قیدی دیا گیا تھا وہ ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے تھے اشاروں میں بات چیت ہوتی تھی۔

ایک دن اس قیدی کو زہریلے سانپ نے کاٹ لیا وہ دوڑا ہوا گاندھی جی کے پاس آیا۔ انہوں نے اسے جیل کے اسپتال میں بھیجنے کا خیال کیا لیکن یہ سوچ کر کہ دیر ہونے سے کچھ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے چاقو مانگا لیکن جو چاقو لایا گیا وہ گندہ تھا انہوں نے اسے الگ رکھ دیا اور اپنے منہ سے چوس چوس کر زخمی انگلی کا خون اور زہر باہر نکال دیا۔ وہ کبھی اپنے ساتھی کی تکلیف برداشت نہ کر سکتے تھے۔

گاندھی جی اب اپنے لباس میں برابر کمی کرتے چلے جا رہے تھے کبھی تو صرف دھوتی ہی پہنے رہتے تھے عام طور پر وہ ننگے پاؤں رہتے تھے بہت کچھ ہوا تو چپل پہن لیتے تھے یہ بات نہیں تھی کہ جیل کی زندگی میں ایسا کرنا ضروری ہو بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ آرام کی چیزوں کا استعمال کم سے کم کیا جانا چاہیے۔ وہ برابر تھوڑے تھوڑے وقفے سے برت رکھا کرتے تھے جس سے وہ کمزور اور دبلے ہوتے چلے جا رہے تھے برودا میں ان کا وزن صرف نوّے پاؤنڈ رہ گیا تھا ان کے سر میں بال بہت کم رہ گئے تھے وہ سر پر کوئی کپڑا یا شال ڈالے رہتے تھے۔ ۱۹۲۵ء سے وہ چشمہ لگانے لگے تھے۔ عرصے بعد جب کوئی انہیں پہلی بار دیکھتا تو دنگ رہ جاتا ان کی ایک ایک پسلی دکھائی دیتی وہ بہت کمزور نظر آتے تھے ان کے سر پر جو تھوڑے سے بال رہ گئے تھے وہ بھی سفید ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے پوپلے منہ کی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اتنی کمزوری محسوس کرنے لگتے کہ چلنے کے لیے انہیں سہارا لینا پڑتا۔ یہ سہارا وہ عام طور پر اپنی بھتیجیوں یا گود لی ہوئی لڑکی لکشمی سے لیتے۔

گاندھی جی کے ماننے والے اکثر کانگرسی سوراجی کہلاتے تھے کچھ دوسرے تبدیلی مخالف کہلاتے تھے۔ گاندھی جی کے برودا جیل جانے کے بعد کانگریسیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ تحریک عدم تعاون جاری رکھنے کے موافق تھے کچھ مخالف یہ اختلاف ۱۹۲۳ء کے پورے سال بھر چلتا رہا۔ جیل میں گاندھی جی کو اپنڈی سائٹس (آنت بڑھ جانے کا مرض)

کی تکلیف ہوگئی تو ساسون اسپتال میں جو پونا ہی میں ہے ان کا آپریشن ایک انگریز سرجن نے کیا جو کامیاب رہا اگرچہ عین آپریشن کے وقت بجلی فیل ہوگئی تھی۔

اس عرصے میں گاندھی جی کی اہلیہ کستوربائی سابرمتی آشرم میں رہیں۔ گاندھی جی بیماری کی بنا پر جگہ جگہ ان کی رہائی کے لیے تجویزیں منظور کی جانے لگیں جیسے مجلس قانون ساز میں اور صوبائی اداروں میں۔ حکومت نے صحت کی خرابی کی بنا پر گاندھی جی کو مئی ۱۹۲۴ء میں رہا کردیا۔ حکومت نے سوچا کہ جب کانگرس میں اختلاف ہے تو گاندھی اسی میں الجھے رہیں گے اور کوئی باغیانہ قدم نہ اٹھا پائیں گے۔

لیکن گاندھی جی کو اپنی رہائی پر خوشی نہیں تھی کیونکہ وہ بیماری کے باعث رہا ہونا اپنے لیے مناسب نہ سمجھتے تھے۔ لیکن لوگوں کو ان کی رہائی کی بے حد خوشی ہوئی اور ان کے پاس سیکڑوں مبارک بادی تار آئے۔ اس سے انہیں فکر ہوئی کہ لوگوں کو امید ہو رہی ہے کہ وہ جلد ہی کوئی بڑا کام کریں گے لیکن وہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھے۔ وہ صحت ٹھیک کرنے کی غرض سے بمبئی میں جوہو کے سمندری ساحل پر رہے وہاں ہزاروں لوگ ان کے درشن کے لیے آتے تھے۔ کیونکہ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ مشہور ہوگئے تھے اور قوم کی شان مانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی دوربین نظروں سے دیکھا کہ سیاسی فضا بدل گئی ہے اور یہ محسوس کیا کہ ان کا پچھلا پروگرام — عدالتوں، کونسلوں، اسکولوں، فوجی خدمتوں اور بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ — پوری طرح کامیاب نہیں ہوا اور کانگرس کے بہت سے لیڈروں کا اہنسا پر عقیدہ پختہ نہیں ہے۔

انہوں نے طے کیا کہ عام ستیہ گرہ بند کردی جائے۔ سوراجیوں کی بات انہیں ٹھیک معلوم ہو رہی تھی۔ انہوں نے سوراجیوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اب صرف بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ جاری رکھا جائے اور انہیں دعوت دی کہ وہ اختلاف ختم کرکے کانگرس کا ایک جز بن جائیں۔ سوراجیوں نے یہ بات مان لی۔ سوراجیوں سے صلح کے معنے لوگوں نے یہ سمجھے کہ ان کے آگے جھک جانا پڑا۔ بہر حال کچھ دنوں کے بعد بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ بھی ختم ہوگیا۔

ہندوستان میں قومی جذبے کے پیدا ہونے کے آغاز میں اور تحریک عدم تعاون کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر خوب کام کیا لیکن ۱۹۲۳ء میں ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ پڑگیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مسلمان لیڈروں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ جب برطانیہ کے خلاف بغاوت زور پکڑے گی تو ان کے فرقے کو کوئی تحفظ نہیں ملے گا۔

۱۹۲۱ء کے شروع میں ہی کچھ ہندو مسلم فساد ہو گئے تھے۔ ہندو مسلم اختلاف دو باتوں سے پیدا ہوا۔ ایک تبدیل مذہب کی کوشش۔ دوسرے یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاسی لوگ کبھی ایک فرقے کے ساتھ کبھی دوسرے فرقے کے ساتھ جانب داری برتتے ہیں۔ گاندھی جی کے نکتہ چیں کہتے تھے کہ انہوں نے تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کو ملا کر مسلمانوں میں ایسی بیداری پیدا کر دی جو خطرے کا باعث بن سکتی ہے اس کے جواب میں گاندھی جی کا یہ کہنا تھا کہ بلا کسی تعصب کے تعمیری کام آگے بڑھانے کے لیے خلافت تحریک اور تحریک سول نافرمانی کا اتحاد ضروری تھا۔

گاندھی جی کی رہائی کے بعد ستمبر ۱۹۲۴ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تین شہروں میں زبردست فساد ہوا جس کے نتیجے میں ۱۵۵ ہندو مارے گئے اور ان بستیوں سے باقی ہندو آبادی بھگا دی گئی۔

گاندھی جی کو یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ لوگ سچی اہنسا کی پابندی نہیں کر رہے ہیں اس لیے انہوں نے سزا کے طور پر تزکیہ نفس کے لیے اکیس دن کا برت دلی میں اپنے ایک مسلمان ساتھی ڈاکٹر انصاری کے گھر پر رہ کر رکھا۔ گاندھی جی کے اس برت سے ملک بھر کو پریشانی پیدا ہو گئی۔ ان کے لیے دعائیں کی جانے لگیں۔ پروگرام کے مطابق انہوں نے اپنا برت ختم کیا۔ ان تین ہفتوں میں ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اتحاد کا پھر سے عہد کیا اور تشدد کی مذمت کی۔

لیکن چند مہینوں بعد ان میں پھر اختلاف پیدا ہو گیا پنجاب میں لگ بھگ ایک درجن فساد ہوئے۔ اس عرصے میں گاندھی جی مسلمانوں کے مسائل سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور قومی تحریک میں مسلمانوں کو مناسب جگہ دلانے کے کوشاں تھے۔

جب ۱۹۲۵ء شروع ہوا تو گاندھی جی کو اس اختلاف کا کوئی حل نکلنے کی امید باقی نہیں رہی ان مسئلوں کے بارے میں وہ برابر 'نوجیون' میں لکھتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ وہ یہ تھا کہ تین سال تک وہ سرگرم سیاست سے الگ رہیں گے ان تین برسوں میں سے دو سال انہوں نے لوگوں کو سماجی تعلیم دینے کی غرض سے ملک کے طویل دورے میں صرف کیے۔

دورے کے دوران وہ جہاں بھی جاتے وہ دیوتا کی طرح پوجے جاتے۔ دورے کے سلسلے میں انہوں نے ہر قسم کی سواری استعمال کی ـــ ریل، بیل گاڑی، موٹر اکثر وہ پیدل چلا کرتے تھے ـــ وہ جنگل اور میدان کی پروا کیے بغیر دور دور کے دیہاتوں میں جاتے تھے جب ریل پر

سفر کرنا ہوتا تو وہ تیسرے درجے میں بیٹھتے کیونکہ عام لوگ اسی درجے میں بیٹھ کر آتے جاتے تھے لیکن صحت کی خرابی کی بنا پر کبھی کبھی سکنڈ کلاس میں سفر کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے انگریزی حکومت کے ایک افسر نے جس نے ان دنوں انہیں گرفتار کیا تھا۔ ان کے بارے میں کہا تھا۔ "وہ اوسط قد کے سینک جیسے دبلے پتلے آدمی ہیں"

اپنے اس دورے میں وہ جہاں بھی تقریر کرتے چھوت چھات مٹانے پر بہت زور دیتے تھے اور لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ چرخہ چلانا چاہیئے تاکہ اپنے سوت سے اپنا کپڑا تیار ہو سکے انہیں یقین تھا کہ اگر آدمی آدھے گھنٹے بھی سوت کات لے تو اس کی آمدنی میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ وہ اس پر اس لیے زور دیتے تھے کہ ہندوستان کے کسانوں میں بھیانک غریبی پائی جاتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۶ء تک لگ بھگ ... ۴۲ عورتیں سوت کاتنے لگیں ساڑھے تین ہزار آدمی بنائی کے کام میں لگ گئے اور ملک کے ۱۵۰۰ گاؤں میں ڈیڑھ سو پیداواری مرکز قائم ہو گئے جن میں سو سے زیادہ لوگ لگے تھے ان لوگوں کی مجموعی مزدوری نولاکھ کے قریب تھی۔ قوم کو خودکفیل بنانے والے مقصد کے سلسلے میں یہ حیرت انگیز ابتدا تھی۔

انہوں نے سنہ ۱۹۲۶ء کا پورا سال سابرمتی آشرم میں بسر کیا جسے قائم ہوئے اب دس سال ہو گئے تھے۔ گاندھی جی کی 'خود نوشت سوانح عمری' ہفتہ وار 'نوجیون' میں شائع ہو رہی تھی انہوں نے اسے اپنی مادری زبان گجراتی میں لکھا تھا بعد میں اس کا ترجمہ ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں ہوتا گیا۔ ان کے مقررہ کاموں میں سے ایک کام دوشنبہ کو خاموش رہنا تھا تاکہ گیان دھیان کر سکیں۔ اس دن اگر بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ پرچے پر لکھ کر بات کر لیتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں گاندھی جی نے وسیع پیمانے پر پھر ہندوستان کا دورہ شروع کر دیا۔ دن میں کبھی کبھی چھ جلسوں میں تقریر کرتے رفتہ رفتہ اس مصروف پروگرام کا صحت پر خراب اثر پڑنے لگا۔ مارچ میں وہ سخت بیمار پڑ گئے ان کے خون کا دباؤ زیادہ بڑھ گیا اور وہ بہت کمزور ہو گئے ایسی صورت میں انہیں کسی ٹھنڈی جگہ جاکر آرام کرنے کی ضرورت تھی۔

دو مہینے وہ ریاست میسور میں ایک ٹھنڈی جگہ پر رہے وہاں ان کی طبیعت کافی ٹھیک ہو گئی۔ انہوں نے پرانا پروگرام پھر شروع کر دیا۔ اس دوران وہ کھادی کے پرچار کے لیے پیسے جمع کرتے رہتے تاکہ اس کے ذریعہ غریبوں کی امداد کا بندوبست کر سکیں۔

بچپن

جوانی

گاندھی جی اور ان کی شریک حیات کستور با گاندھی
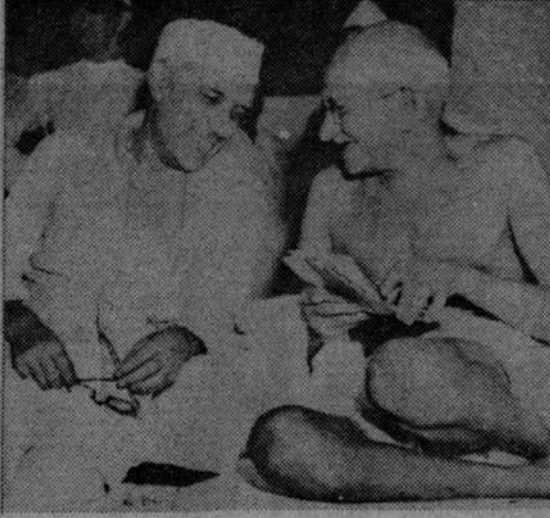
گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو
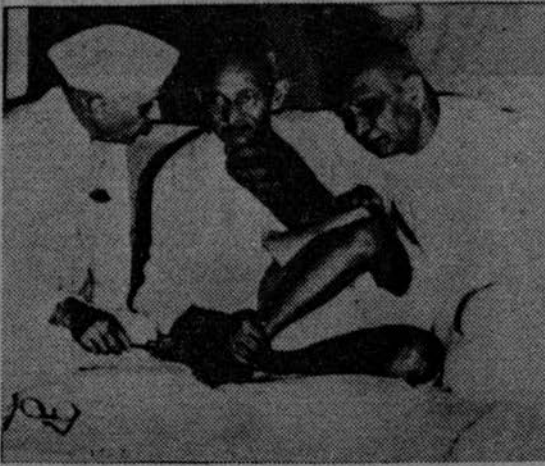
گاندھی جی پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل
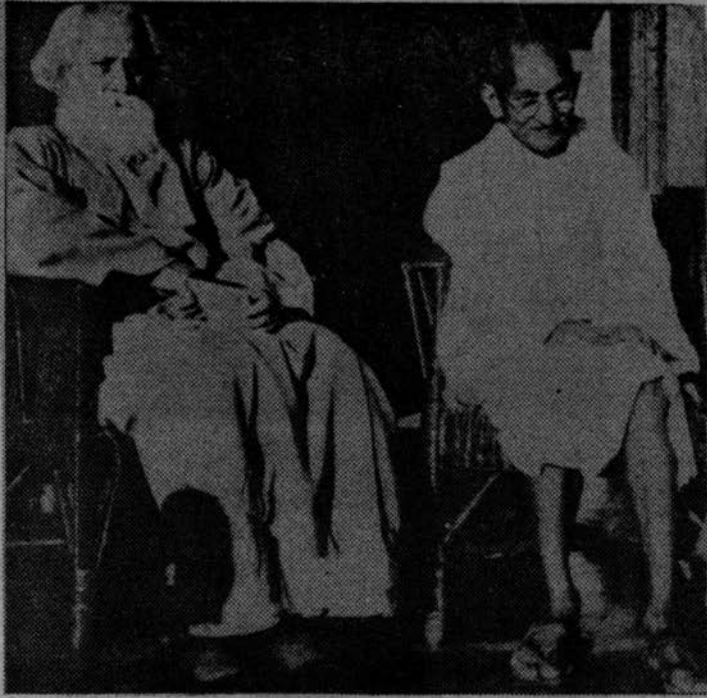
گاندھی جی اور رابندر ناتھ ٹیگور

گاندھی جی محو مطالعہ

سروجنی نائیڈو اور گاندھی جی
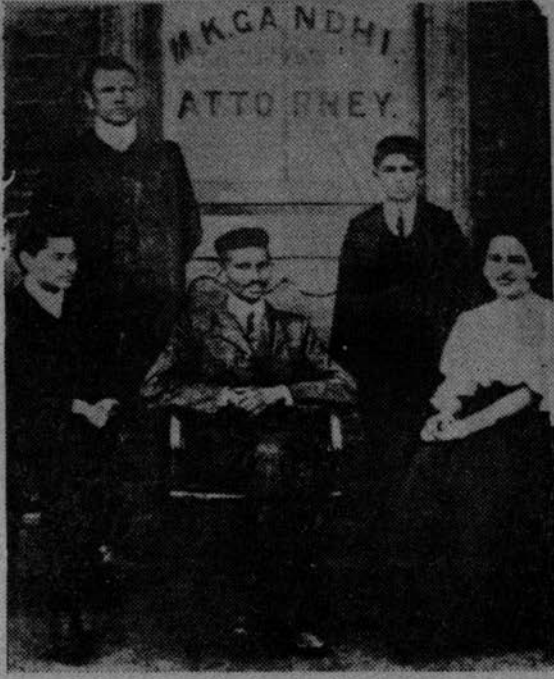
گاندھی جی ڈربن (ساؤتھ افریقہ) میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ

وہ خود غریب تھے ان کی اپنی نجی چیزیں بہت معمولی اور انی گنی تھیں ۔ ایک جوڑ چپل، ایک جوڑ چٹی، عینک، دو پیالے، ایک چمچا اور کانٹا، مٹ چینی کے بے تین بندر، ڈائری، دعا کی کتاب، اگالدان، کاغذ تراش، قلم اور پنسل ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گاندھی جی کی یہ حالت ان لوگوں سے بالکل مختلف تھی جن کے پاس واقعی کوئی ذاتی جائداد نہیں ہوتی کیونکہ ہزاروں لوگ ان کو ہر وہ چیز دینے کو تیار تھے جس کی انہیں ضرورت ہو۔ مشہور شاعرہ اور کانگرسی لیڈر سروجنی نائیڈو گاندھی جی کے اصولوں کی بڑی تعریف کرتی تھیں لیکن کبھی کبھی ہمت کر کے گستاخی بھی کر دیتی تھیں ۔ انہوں نے ایک بار گاندھی جی سے کہا آپ یہ نہیں محسوس کرتے کہ آپ کو غریبی کی حالت میں رکھنے کے لیے ملک کو کتنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ۔ گاندھی جی کے برعکس بیسیوں قومی لیڈر ایسے تھے جو نہ صرف یہ کہ خوب خرچ کرتے تھے بلکہ تزک بھڑک والی زندگی بسر کرنے کا شوق بھی رکھتے تھے اسی لیے گاندھی جی کی یہ قربانی صحیح اور مناسب تھی ۔

۱۵۔ نمک ستیہ گرہ

۱۹۲۸ء میں ہندوستانی لیڈروں نے ستیہ گرہ تحریک میں پھر سے جان ڈالی ۔ اس نئی بیداری کا آغاز بردولی (گجرات) سے ہوا۔ وہاں لگان میں اضافے کے خلاف تحریک شروع کی گئی ۔ کسانوں نے بمبئی کی حکومت کی کامیاب مخالفت کی جس کے نتیجے میں لگان میں بائیس فی صد جو اضافہ کیا گیا تھا وہ گھٹا کر پانچ فی صد کر دیا گیا ۔ آئینی مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا لیکن اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی نمائندہ نہیں تھا اس لیے ظاہر ہے کہ ہندوستانی لیڈروں نے اس کی مخالفت کی اور عوام سے اپیل کی کہ وہ اس کا بائیکاٹ کریں ۔

گاندھی جی کی بھی یہی رائے تھی ۔ انہوں نے کلکتے میں سیاسی زندگی میں پھر لوٹنے کا فیصلہ کیا ۔ اس وقت وہاں کانگرس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا لیکن جلد ہی انگریز حکومت نے ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی ۔ بدیسی کپڑے کی ہولی جلانے کے الزام میں انہیں مارچ ۱۹۲۹ء میں گرفتار کر لیا گیا ۔ کلکتے کی عدالت نے ان پر صرف ایک روپیہ جرمانہ کیا ۔ اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں اسی طرح بدیسی کپڑے کی ہولیاں جلائی گئیں ۔

ملک میں بے چینی تیزی سے پھیل رہی تھی خاص طور پر کارخانوں میں کام کرنے والے

مزدوروں میں کچھ نوجوان دہشت پسندوں نے کہیں کہیں دہشت پیدا کی۔ گاندھی جی اور ان کے ساتھی اس کے سخت خلاف تھے۔ اس قانون شکنی کی بنا پر حکومت نے قانون کی اور زیادہ سختی سے پابندی شروع کر دی۔ میرٹھ سازش کے مشہور معاملے کے سلسلے میں مزدور تنظیم کے کچھ لیڈروں اور کچھ دوسرے لوگوں کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اس زمانے میں ایک بہت سنسنی خیز واقعہ ہوا وہ یہ تھا کہ دہشت پسندوں نے اس ٹرین پر جس میں وائسرائے لارڈ ارون سفر کر رہے تھے بم پھینک دیا مگر انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچا۔

کانگرس کا اگلا اجلاس لاہور میں دسمبر کے مہینے میں ہوا۔ اس میں کانگرس نے صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے کانگرسی ممبروں سے استعفا دینے کی اپیل کی کل ہند کانگرس کمیٹی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ تحریک عدم تعاون شروع کرے کہنے کی ضرورت نہیں اس کی رہنمائی کا کام گاندھی جی کے سپرد کیا گیا۔

نئی مہم میں پہلے قدم کے طور پر انھوں نے ملک بھر سے اپیل کی کہ ۲۶ رجنوری کو 'یوم آزادی' منایا جائے اس دن ہزاروں لاکھوں لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کا عہد کیا اگر کانگرس چاہتی تو لوگ حکومت کو ٹیکس دینا بند کر دیتے۔ اب گاندھی جی کی تحریک کو پوری قوم کی حمایت حاصل ہو رہی تھی۔

اس کے بعد گاندھی جی نے طے کیا کہ نمک قانون توڑا جائے۔ اسے توڑنے کے لیے انھوں نے سمندر کے ساحل تک پیدل جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ پیدل سفر نئی ہندوستانی تاریخ کا بہت ہی مشہور واقعہ شمار کیا جاتا ہے۔

یہ پیدل سفر احمد آباد سے شروع ہوا اور ڈنڈی گاؤں پہنچ کر ختم ہوا۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ گرہ کا آغاز سمندر کے کنارے ہوا اور یہ ستیہ گرہ پورے ایک سال چلی۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ حکومت وہ قانون واپس لے لے جس کے ذریعے اس نے نمک پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ ہندوستانی لیڈروں کا خیال تھا کہ نمک جیسی ضرورت کی چیز پر ٹیکس لگانا زیادتی ہے اور اس قسم کے محصول اور قانون کا اثر غریب عوام پر پڑتا ہے یعنی اس سے ملک کی پوری آبادی متاثر ہوتی ہے۔

گاندھی جی کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ قانون ایسی حکومت نے بنائے ہیں جو عوام کی نمائندگی نہیں کرتی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بدیسی اور بدنام ہے گاندھی جی کی نگاہ میں ان قانونوں کی

مخالفت کا مقصد صرف ان کا واپس کرانا نہیں تھا بلکہ اس سے کہیں بڑا تھا یعنی مکمل آزادی حاصل کرنا۔ ابراہم لنکن کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ناانصاف حکومت کو یا تو بدل دے یا اس سے نجات حاصل کرلے۔

'ڈانڈی سفر' مہم کے خاص لیڈر گاندھی جی تھے۔ ان کے ساتھ اور دوسرے کانگرسی لیڈر تھے جیسے چکرورتی راج گوپال آچاریہ، ولبھ بھائی پٹیل، جواہرلال نہرو اور ستیش چندر گپت جواہرلال نہرو جو آگے چل کر آزاد ہندوستان کے وزیراعظم ہونے والے تھے اس وقت کانگرس کے صدر تھے۔

اس سفر میں گاندھی جی کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو سابرمتی آشرم میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ آکر نمک ستیہ گرہ میں شریک ہوئے ان میں زیادہ تر ہندو تھے۔ لیکن کچھ مسلمانوں نے بھی حصّہ لیا اور تاجروں نے بھی مدد کی۔ اس ستیہ گرہ میں عورتیں بھی شامل تھیں ان کے مقابلے میں کھڑے تھے سرکاری افسر، پولیس اور فوج۔

بغیر ہتھیار والے اس مارچ کی تیاری بڑی انوکھی تھی رضاکار ستیہ گرہیوں نے ایک عہد نامہ پڑھا جسے کانگرس کمیٹی کے ایک جلسے نے حال ہی میں منظور کیا تھا اس میں کہا گیا تھا:۔

"میں بلاتشدد والی اس تحریک عدم تعاون میں حصّہ لینا چاہتا ہوں جسے ملک کی آزادی کے لیے کانگرس شروع کرنے جا رہی ہے"

"میں کانگرس کے اس مقصد سے متفق ہوں کہ تمام پرامن اور آئینی ذرائع استعمال کرکے ملک کے عوام مکمل آزادی حاصل کریں۔"

میں جیل جانے کے لیے اور دوسری ہر طرح کی وہ تکلیف اور سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں اور خوشی سے تیار ہوں جو اس تحریک کے سلسلے میں مجھے دی جائے۔"

"اگر میں جیل بھیج دیا گیا تو کانگرس فنڈ سے میں اپنے بال بچوں کے لیے کسی طرح کی مدد نہ مانگوں گا"

"میں ان سب ہدایتوں کی بلا عذر پابندی کروں گا جو تحریک کے لیڈر وقت بوقت پر جاری کریں گے"

پروگرام سیدھا سادہ تھا کہ ستیہ گرہی سمندر تک پیدل جائیں گے اور وہاں سمندر کے پانی سے نمک بنا کر نمک قانون توڑیں گے۔ سردار پٹیل نے اس راستے کا جاکر اچھی طرح

معائنہ پہلے ہی سے کر لیا اور لوگوں کو پورا پروگرام سمجھا دیا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ آپ کو شراب اور دوسری نشیلی چیزوں سے دور رہنا، چرخہ چلانا، تعمیری کام کرنا اور چھوت چھات کو ختم کرنا ہوگا

کانگریس پارٹی نے عام اعلان کر دیا کہ اگر ضرورت پڑی تو عدم تعاون کے ذریعہ آزادی کے لیے تحریک چلائی جائے گی۔ گاندھی جی نے وائسرائے لارڈ اروِن کو ایک خط بھیجا جس میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ پورا پروگرام بتا دیا اسی کے ساتھ خط میں عوام کی شکایتوں کا بھی ذکر کر دیا۔

اپنے خط میں انہوں نے لکھا کہ تبدیلی لانے کے لیے اہنسا کو ایک طاقت کی شکل میں استعمال کیا جائے گا۔ انہوں نے بات چیت کے ذریعہ سمجھوتے کی تجویز وائسرائے کے سامنے رکھی اپنے خط میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ سمجھوتہ اگر نہیں ہوتا ہے تو وہ خود ستیہ گرہ تحریک کی رہنمائی کریں گے جس میں نمک قانون کی بھی خلاف ورزی کی جائے گی۔ حکومت کی جانب سے مختصر طور پر خط پہنچنے کی اطلاع ملی۔

گاندھی جی نے 'نوجیون' میں لکھا اگر حکومت میری سب گیارہ باتیں مان لیتی ہے تو میں ستیہ گرہ نہ شروع کروں گا۔ یعنی لگان میں کمی، نمک پر سے ٹیکس ہٹانا، بدیسی کپڑے پر پابندی لگانا وغیرہ۔

حکومت کی جانب سے ٹھیک جواب نہ ملنے پر سمندر کی طرف سفر مقرر وقت پر شروع کر دیا گیا۔ ۱۱ر مارچ کو عبادتی جلسہ ہوا۔ اگلے دن گاندھی جی اور ۷۹ ستیہ گرہی سابرمتی آشرم (احمدآباد) سے ڈانڈی کے لیے نکلے۔ گاندھی جی روزانہ جیسے چار بجے اٹھتے تھے اسی طرح اٹھے انہوں نے عبادت کرائی اور پھر سب چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں عام جلسے ہوتے جن میں گاندھی جی تقریر کرتے۔ ہمیشہ کی طرح وہ روز سوت کاتتے۔ خطوں کا جواب دیتے اور 'نوجیون' کے لیے لکھتے۔

گاندھی جی نے گاؤں میں رہنے والوں سے اپیل کی کہ وہ تعمیری کام کریں اور تشدد سے دور رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ نمک قانون توڑیں اور تحریک عدم تعاون میں حصہ لیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ سفر تحریک عدم تعاون جاری رکھنے کے لیے ایک طرح کی قربانی اور ہدایت ہے۔ اگرچہ گاندھی جی کی عمر اکسٹھ سال کی تھی لیکن وہ سب سے تیز چلتے تھے گاؤں والے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگتے تھے اور ان کی راہ

میں پھول بچھاتے معلوم ہوتے تھے۔

تمام ستیہ گرہی سابرمتی آشرم کے تھے ان کی عمریں ۱۶ سے لے کر ۶۱ سال تک تھیں ۲۴۱ میل پیدل چلنے کے بعد ۲۶ دن میں یہ سب لوگ ۵ اپریل ۱۹۳۰ء کو ڈانڈی پہونچے ۶ اپریل کو سمندر کے کنارے گئے اور دیگچیوں میں پانی ابال کر نمک بنایا۔ گاندھی جی نے اعلان کیا کہ گاؤں والوں کو نمک بنانا سکھایا جائے گا اور انہیں اس کی اہمیت بھی بتائی جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اس کام میں سزا ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے یہ باتیں چھپوا کر پورے ہندوستان میں تقسیم کرادی گئیں۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ بڑے پیمانے پر نمک بنایا گیا دکانیں بند کردی گئیں اور پھر ستیہ گرہی لیڈر گرفتار کر لیے گئے ان کی ہمدردی میں گاؤں کے مکھیاؤں نے استعفے دے دیئے بہت سی جماعتوں کی جانب سے مظاہرے کیے گئے لیکن ان سب باتوں کے باوجود حکومت نے اسے کوئی سنگین معاملہ خیال نہیں کیا۔ کچھ افسروں نے اسے بچوں کا کھیل قرار دیا۔ کچھ نے اسے تخیلی منصوبہ بتایا اور یہ اعتماد ظاہر کیا کہ اس سے نمک کے سرکاری کاروبار پر کوئی اثر نہ پڑے گا خاص طور پر ایسی صورت میں جب تحریک کے کچھ لیڈروں کو جیل میں بند کر دیا جائے گا۔

شروع میں حکومت کا یہی خیال تھا کہ لیڈروں کو گرفتار نہ کیا جائے تاکہ ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہو اور رفتہ رفتہ ستیہ گرہ تحریک ختم ہو جائے لیکن بعد میں حکومت نے رائے بدل دی، سردار پٹیل تو ۷ مارچ ہی کو پکڑ لیے گئے تھے۔ اپریل کے شروع میں جواہر لال نہرو کو گرفتار کیا گیا۔ ان کی گرفتاری کے بعد کانگرس کے صدر کی ذمہ داری ان کے والد موتی لال نے سنبھال لی۔

اس کے بعد اندھا دھند گرفتاریاں ہونے لگیں مجموعی طور پر چھ ہزار آدمی گرفتار کیے گئے جن میں کانگرس کے سبھی بڑے لیڈر شامل تھے اکثر کو نمک قانون توڑنے کے جرم میں سزا دی گئی۔ ایسے لوگوں میں تھے مدن موہن مالویہ، جتیندر موہن، سین گپت اور گاندھی جی کے چوتھے لڑکے دیوداس گاندھی۔ اسی درمیان گاندھی جی بھی گرفتار کر لیے گئے۔ ان کی تحریک کی باگ دوڑ عباس طیب جی کے سپرد کردی گئی۔

کئی جگہوں پر لوگوں نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ جگہوں پر فساد ہو گئے

خاص طور پر کراچی، چٹ گاؤں اور کلکتہ میں۔ اس تشدد سے رنجیدہ ہوکر گاندھی جی نے کہا کہ اگر ستیہ گرہی اپنے اصولوں کی ٹھیک سے پابندی نہ کریں گے تو میں ان کے خلاف ستیہ گرہ شروع کر دوں گا۔ مئی کے شروع میں گرفتاری سے پہلے انھوں نے لارڈ ارون کو دوسرا خط لکھا۔ اس میں انھوں نے کہا کہ اگر حکومت نمک ٹیکس ختم نہیں کرتی ہے تو میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھرسنا جاکر سرکاری نمک گودام پر قبضہ کرلوں گا۔ ۵ رمئی کو کراڑی نام کے گاؤں میں گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا اور بلا کسی مقدمے کے نظر بند رکھا گیا۔ لیکن رضا کاروں کے جتھے پیدل آکر جمع ہوتے گئے۔ دھرسنا کے نمک گودام پر دھاوے کی قیادت امام صاحب نے کی جو احمد آباد آشرم کے ایک ممبر تھے۔ پولیس نے ستیہ گرہیوں پر حملہ کر دیا لیکن رضا کار بڑھتے ہی چلے گئے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے انتظام کر دیا گیا۔

دھرسنا کا تجربہ ستیہ گرہ کے نظریے کی ایک بڑی کسوٹی تھی۔ ستیہ گرہیوں کو اپنے عہد کے مطابق تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دینا تھا ان کا کام تھا کہ پولیس چاہے مارے یا ڈنڈے برسائے یہ اس سے بچنے یا اسے ہٹانے کی کوشش نہ کریں گے بلکہ اپنے کو پٹنے دیں گے اور ساتھ ہی ساتھ پولیس سے درخواست کریں گے کہ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہوکر قانون توڑے ان سب اصولوں کی پابندی ستیہ گرہیوں نے اتنی خوش اسلوبی سے کی کہ کچھ سپاہیوں نے مارپیٹ جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔ تشدد کا مقابلہ عدم تشدد کے ذریعہ کیے جانے کے لیے دھرسنا کا واقعہ ایک نمونہ بن کر پوری دنیا میں مشہور ہو گیا۔

امریکی نمائندے دب ملر اس وقت وہاں موجود تھے انھوں نے دھرسنا کا جو آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے وہ صحافت کا ایک شاہکار مانا جاتا ہے۔ انھوں نے عدم تشدد کے طریقوں کو استعمال کرنے والے رضا کاروں کے صبر وضبط کی بڑی تعریف کی ہے انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں دھرسنا ستیہ گرہ کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔

دھرسنا مظاہرے کی رہنمائی شریمتی سروجنی نائیڈو نے کی تھی جو شاعرہ اور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ آزادی کے بعد وہ ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے اتر پردیش کی راج پال (گورنر) مقرر کی گئیں۔ ستیہ گرہ شروع کرنے سے پہلے سروجنی نائیڈو نے گاندھی ٹوپی پہنے ڈھائی ہزار ستیہ گرہیوں کی اجتماعی عبادت کرائی۔

انھوں نے اس عبادتی جلسے میں کہا " گاندھی جی کا جسم جیل میں ہے لیکن ان کی روح

آپ سب کے ساتھ ہے آپ اگر مار بھی ڈالے جائیں تب بھی ہتھیار نہ چلائیں مار سے بچنے کے لیے بھی آپ کو اپنا ہاتھ نہیں اٹھانا ہے "

اس کے بعد پیدل کوچ شروع ہوا۔ نمک کے گودام آدھے میل پر تھے۔ ستیہ گرہیوں کی پہلی صف میں گاندھی جی کے دوسرے بیٹے منی لال بھی تھے۔

جب ستیہ گرہی اپنے مقررہ مقام پر پہنچے تو سامنے ہندوستانی پولیس کے چار سو جوان کھڑے تھے ان کو حکم دینے کے لیے انگریز افسر تھے سپاہیوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں ان کے سرے پر لوہے کی شام لگی تھی۔ نمک گودام کے چاروں طرف پانی سے بھری خندقیں تھیں اس گھیرے میں پچیس[۲۵] بندوقچی سپاہی بھی تھے۔

خاموشی کے ساتھ مظاہرہ کرنے والے ستیہ گرہی اس گھیرے سے سو گز کے فاصلے تک پہنچ گئے ان میں سے کچھ نے ایک دستہ بنایا۔ خندق کو پار کیا اور مورچے کی طرف بڑھے۔ ستیہ گرہیوں کو حکم ہوا کہ تتر بتر ہو جائیں۔۔۔ ایک قانون حال ہی میں پاس ہوا تھا کہ پانچ آدمی سے زیادہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ پیدل ستیہ گرہیوں نے اس حکم کی کوئی پرواہ نہیں کی اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

پانچ فٹ لمبی لاٹھیاں ان پر برس پڑیں لیکن کسی نے نہ اُف، کیا اور نہ اپنی حفاظت کے لیے انگلی اٹھائی۔ امریکی صحافی نے لکھا ہے " دس دس کی قطار میں ستیہ گرہی چل رہے تھے پھر ان پر حملہ ہوا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے غیر محفوظ کھوپڑیوں پر ڈنڈے پڑنے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ ستیہ گرہی چوٹ کھاتے گرتے چلے گئے۔ کوئی بے ہوش تھا کوئی درد سے کراہ رہا تھا۔ کسی کا سر ٹوٹا، کسی کا کندھا چور ہو گیا دو یا تین منٹ میں ہی وہاں کی زمین زخمی لوگوں سے یکدم ڈھک گئی۔ ستیہ گرہیوں کے سفید کپڑوں پر خون کے لال لال دھبے پھیلتے جا رہے تھے "

جب پہلی ٹکڑی کے ہر آدمی کو مار کر زمین پر گرا دیا گیا تو پہلے سے چنے ہوئے ستیہ گرہی اسٹیچر لے کر آگے آئے اور پولیس نے انھیں اجازت دے دی کہ وہ زخمیوں کو بغل کی ایک جھونپڑی میں لے جائیں جس سے عارضی طور پر اسپتال کا کام لیا جا رہا تھا۔

اس کے بعد دوسری ٹکڑی تیار ہو گئی اور پہلی کے ساتھ جو برتاؤ ہوا تھا اس کو برداشت کرنے کے لیے وہ آگے بڑھی۔

دب ملر لکھتا ہے :۔ "اگر چہ ان میں سے ہر ایک جانتا تھا کہ چند منٹوں کے اندر مجھ پر مار پڑے گی یا میں مار ڈالا جاؤں گا لیکن کسی کے چہرے پر گھبراہٹ یا خوف کے آثار میں نے نہیں پائے۔ وہ سب کے سب سر اٹھائے شان کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھ رہے تھے ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے نہ تو کوئی باجا بج رہا تھا اور نہ کوئی تالیاں بجا رہا تھا۔"

ان کے ساتھ بھی پہلی ٹکڑی جیسا برتاؤ ہوا اور یہ سلسلہ جاری رہا اتنے زیادہ لوگ زخمی ہو گئے کہ انھیں اٹھا کر لے جانے کا بھی کوئی بندوبست نہیں رہا۔ جن کمبلوں سے ڈولی کا کام لیا جا رہا تھا وہ بھی خون سے لت پت تھے اس طرح عدم تشدد کے ذریعہ مخالفت جاری رہی۔ آخر پولیس کو غصہ آ گیا اور اس نے بے رحمی کے ساتھ لوگوں کے پیٹ اور فوطوں پر لاتیں مارنی شروع کر دیں اور ان کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر گھسیٹنے لگی" یہ سلسلہ گھنٹوں چلتا رہا اس کے بعد سروجنی نائیڈو اور منی لال گرفتار کر لیے گئے۔

ملر نے لکھا ہے کہ بھیانک گرمی پڑ رہی تھی۔ سائباں میں درجہ حرارت ۱۱۴ تھا۔ سردار پٹیل وہاں پہنچے اور باقی لوگوں میں نئی روح پھونک دی۔ امریکی صحافی لکھتا ہے کہ پٹیل نے اپنے ساتھی ستیہ گرہیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے کو مہذب کہنے والی کوئی حکومت، پرامن نہتھے اور حملہ نہ کرنے والے لوگوں کے ساتھ کیونکر ایسی بے رحمی اور جنگلی پن کے ساتھ پیش آسکتی ہے جیسا کہ آج صبح برطانی حکومت نے کیا ہے۔"

ملر نے زخمیوں کو گنا تو ان کی تعداد 322 تھی اور کچھ ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ زخمی ستیہ گرہیوں میں سے دو موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس کے بعد مظاہرہ بند ہو گیا۔

بارش کے ہو جانے سے گوداموں پر دھرنے روک دیئے گئے اور ستیہ گرہ کے لیے اور دوسرے پروگرام بنائے گئے۔ بدیسی چیزوں جیسے شراب اور کپڑے کا بائیکاٹ۔ عام جلسے کرانا اور ان کے لیے پروپیگنڈہ کرنے پر پابندی لگانے والے مخصوص قانونوں کی خلاف ورزی کرنا وغیرہ۔

۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے اراکین جیل سے رہا کر دئے گئے برطانی حکومت سمجھوتے کی طرف مائل ہو رہی تھی لیکن عدم تعاون کی تحریک جاری رہی۔ گاندھی جی کے کہنے پر لارڈ ارون ان سے ملے اور تین ہفتوں میں آٹھ

ملاقاتیں ہوئیں۔

۔ ۴ مارچ کو ایک سمجھوتہ ہوا جو گاندھی ارون سمجھوتے کے نام سے مشہور ہے اس کے مطابق یہ طے ہوا کہ کانگرس اپنی تحریک واپس لے لے گی اور حکومت قابلِ اعتراض قانون رد کر دے گی اور تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں گرفتار کیے جانے والوں کو چھوڑ دے گی۔ سمجھوتے کے ذریعہ حکومت نے جو باتیں مانیں وہ ان مانگوں کا ایک چھوٹا سا حصّہ تھا جو مانگیں کانگرس کر رہی تھی۔

۔ وائسرائے اور گاندھی جی کے درمیان جو بات چیت ہو رہی تھی وہ ونسٹن چرچل کو بالکل پسند نہیں تھی۔ اس نے لکھا ہے " یہ دیکھ کر گھن آتی ہے اور شرم محسوس ہوتی ہے کہ جو شخص ایک زمانے میں انرٹیمپل میں وکیل رہا ہو وہ اب باغی فقیر بن کر نیم برہنہ لباس میں وائسرائے کی قیام گاہ میں دندناتا چلا آرہا ہے اور شہنشاہ کے نمائندے سے برابر بیٹھ کر سمجھوتے کی بات چیت کر رہا ہے۔"

۔ بات چیت کے دوران اور بعد میں بھی لارڈ ارون (جو بعد میں لارڈ ہیلی فیکس کہلائے) پر گاندھی جی اعتماد کرتے رہے دونوں کی ایمانداری میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن انگریزوں اور ہندوستانیوں میں سے کچھ شکّی لوگوں نے شک ظاہر کیا۔

۔ گاندھی جی نے ایک ستیہ گرہی کی حیثیت سے ستیہ گرہی اصولوں کے مطابق سمجھوتہ کیا۔ اس سلسلے میں جن لوگوں نے گاندھی جی پر اعتراض کیا ان میں چرچل کے علاوہ دہشت پسند ہندوستانی بھی تھے یہ ایک چھوٹا سا گروہ تھا جو برطانی حکومت اور گاندھی جی دونوں کی مخالفت کرتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ گاندھی جی نہ تو اس گروہ کی حمایت کرتے تھے اور نہ اس کو اپناتے تھے ان لوگوں کے کام کرنے کے ڈھنگ کی تو وہ سخت مذمت اور مخالفت کرتے تھے۔

۔ انھوں نے ایک مرتبہ دہشت پسندوں سے اپنے انوکھے طرز سے کہا " اگر آپ انگریز افسروں کو مار ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے عوض میں مجھے کیوں نہیں مار ڈالتے؟" اس قسم کی بات سوائے گاندھی جی کے کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا تھا یہ ان کا مخصوص ڈھنگ تھا۔ کیونکہ اپنے کو مخالف کی پوزیشن میں رکھ کر سوچنے اور اس کے نقطۂ نظر سے صورت حال کو سمجھنے کی ان کے اندر غیر معمولی اہلیت تھی جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ اپنے حملہ کرنے والوں کے ساتھ جنوبی افریقہ میں کس طرح پیش آئے ہیں۔

ایک بار ایک نوجوان اڈیٹر نے کسی موضوع پر گاندھی جی سے مضمون لکھنے کو کہا اور ساتھ ہی خود بھی اس موضوع پر کچھ لکھ کر ان کے پاس بھیج دیا۔ گاندھی جی نے اسے پڑھا تو انھیں پسند نہیں آیا۔ انھوں نے اسے کاٹ دیا۔ اور نوجوان اڈیٹر کو لکھا "میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے اندر اپنے مخالفوں کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنے کا حوصلہ ذرا بھی نہیں ہے" اس اڈیٹر کا نام تھا رام منوہر لوہیا۔ نوجوان اڈیٹر نے اپنی صفائی پیش کی تو گاندھی جی نرم پڑ گئے۔ اور پھر ایک محبت بھرا خط بھیجا۔

گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ عبادت کی بدولت ان کی زندگی بچی اور عبادت پر عقیدے کی بنا پر ان کی قوت برداشت بڑھ گئی۔ اسی وجہ سے وہ لوگوں سے قوت برداشت پیدا کرنے کی اپیل کیا کرتے تھے۔ عبادت کی اہمیت بتاتے ہوئے انہوں نے شام کے وقت ایک دن لندن میں کہا " عبادت نے میری زندگی بچائی ہے بغیر اس کے میں نہ جانے کب کا پاگل ہو گیا ہوتا۔ مجھے زندگی میں تلخ سے تلخ تجربات حاصل ہوئے ہیں۔ ان سے تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر مایوسی طاری ہو جاتی تھی اس مایوسی سے میں عبادت کی بدولت ہی نکل سکا۔ سچ کی طرح عبادت میری زندگی کا حصہ تو نہیں رہی ہے بلکہ میں نے اسے ضرورت کی بنا پر اپنایا کیونکہ بعض وقت میں نے اپنے کو ایسی حالت میں پایا کہ میں بغیر عبادت کے زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا خدا پر میرا عقیدہ بڑھتا گیا اور عبادت کرنے کا جذبہ ابھرتا گیا۔ اس کے بغیر زندگی سونی اور خالی خالی محسوس ہوتی تھی "

انھوں نے جنوبی افریقہ کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے کہا "ایک بار وہاں ایک عیسائی عبادتی جلسے میں گیا لیکن اس کا کوئی اثر مجھ پر نہیں ہوا۔ اس میں میرا دل لگا ہی نہیں میرے چاروں طرف لوگ خدا سے دعائیں کر رہے تھے لیکن میں خاموش تھا۔ میرے منہ سے کچھ نکلتا ہی نہ تھا انہی کے کہنے کے مطابق میں اس میں بُری طرح ناکام رہا۔"

لندن میں انھوں نے کہا" شروع میں میرا نہ خدا پر عقیدہ تھا اور نہ عبادت پر کافی دنوں تک یہی حال رہا لیکن آگے چل ایک ایسی منزل آئی کہ میں نے محسوس کیا کہ جس طرح جسم کے لیے غذا ضروری ہے اسی طرح روح کے لیے عبادت ضروری ہے۔"

گاندھی اِروِن سمجھوتے کے بہت سے نتیجے نکلے نمک قانون میں تبدیلی کر دی گئی۔ جس سے گاؤں میں بیچنے اور استعمال کرنے کے لیے نمک بنانے اور جمع کرنے کی اجازت

دے دی گئی۔ تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں سزا پانے والے ان سب لوگوں کو چھوڑ دیا گیا جن پر تشدد کا کوئی الزام نہیں تھا۔ پابندی لگانے والے آرڈی نینس واپس لے لیے گئے۔ قرق کی ہوئی یا ضبط کی ہوئی جائداد لوٹا دی گئی۔ ادھر تحریک سول نافرمانی بند کردی گئی اور اس سے متعلق تمام پروگرام بھی ختم کردیے گئے۔ جیسے قانون کی منظم طریقے پر خلاف ورزی، لگان اور دوسرے سرکاری قرضوں کو نہ ادا کرنا غیر فوجی اور فوجی سرکاری ملازمین سے استعفےٰ دینے کی اپیل کرنا اور عدم تعاون کی حمایت کرنے والے اخبارات شائع کرنا۔ آخر میں آئینی اصلاح کے کاموں میں کانگرس کے نمائندے لیے جانے لگے۔ قرض، تحفظ، جماعتی حکومت اور اقلیتوں کی صورت حال وغیرہ مسائل بات چیت میں شامل کیے گئے۔

پہلی گول میز کانفرنس

۱۶ — گول میز کانفرنس میں

سول نافرمانی کے نتیجے میں ہونے والے سمجھوتے کے کچھ ہی دنوں بعد لارڈ اردن ہندستان سے چلے گئے اور ان کی جگہ لارڈ ولنگٹن آئے جو زیادہ ملنسار نہیں تھے۔ بے چینی پھر پیدا ہونے لگی خاص طور پر ان لوگوں میں جنھیں گاندھی اردن سمجھوتے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا یا پھر ان لوگوں میں جنھیں حکومت کی جانب سے سمجھوتے پر ٹھیک ٹھیک عمل نہ ہونے سے تکلیف پہونچی تھی۔ گاندھی جی نئے وائسرائے سے ملے اور مطالبہ کیا کہ لوگوں کی شکایتوں کی جانچ کی جائے۔ ایک نیا سمجھوتہ ہوا جس میں حکومت نے لوگوں کی شکایتوں پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ انگلستان میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے یہ طے پایا کہ تنہا گاندھی جی کانفرنس کی نمائندگی کریں گے۔

جس گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کو شرکت کے لیے نامزد کیا گیا تھا وہ ان تین کانفرنسوں میں سے دوسری تھی جو برطانوی حکومت نے طلب کی تھیں۔ پہلی کانفرنس ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی لیکن کانگرس کی اس میں کوئی نمائندگی نہیں ہوئی تھی اگرچہ دوسری پارٹیوں اور گروہوں کے بہت سے لوگ ہندوستانی نمائندوں کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ ان کانفرسوں کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی دشواریوں کا حل تلاش کیا جائے۔ پہلی کانفرس سے ایسا محسوس ہوا کہ برطانیہ کی لیبر پارٹی کی حکومت آزادی کے لیے ہندوستانیوں کے جذبات سے کچھ ہمدردی رکھتی ہے۔

گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گاندھی جی نے سفر کا آغاز ۲۹ اگست ۱۹۳۱ء میں ٹرین سے کیا۔ بمبئی پہونچ کر وہ 'ایس۔ ایس راجپوتانہ' نام کے جہاز پر لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دو سکریٹری مہادیو ڈیسائی اور پیارے لال تھے ان کے علاوہ گاندھی جی کے بیٹے دیوداس گاندھی، میرا بہن سروجنی نائیڈو اور مدن موہن مالویہ تھے۔

جہاز پر گاندھی جی نے سفر نیچے درجے میں کیا اور اپنا زیادہ تر وقت انھوں نے ڈیک پر ہی گذارا۔ ان کا روز کا پروگرام پہلے ہی جیسا تھا — سوت کاتنا، پڑھنا، عبادت کرنا وغیرہ ایک

نیا کام اور بڑھ گیا تھا وہ تھا جہاز پر ساتھ سفر کرنے والے انگریز بچوں سے دوستی کرنا۔ عدن اور مارسیلز میں دوستوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ۱۲ر دسمبر کو وہ لندن پہونچے اور وہاں مس موریل لسٹر نام کی امن پسند سماجی کارکن کے ساتھ ٹھہرے۔ ان کا گھر کنگس لے ہال میں تھا۔ جو لندن کے مشرقی حصے میں ایک غریب بستی ہے۔

شہر کے اس حصے کو انھوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا کیونکہ وہاں ہندوستان کی طرح پریشان حال لوگ رہتے تھے۔ لنکاشائر کی مزدور بستی بھی گاندھی جی دیکھنا چاہتے تھے۔ میرابہن، مہادیو اور ساتھ آنے والے دوسرے لوگ ان دوروں میں گاندھی جی کے ساتھ رہے۔ جب ان کی ٹرین لنکاشائر پہنچی تو مجمع اکٹھا ہونے لگا۔ میرابہن نے لکھا ہے کہ جب لوگوں نے گاندھی جی کو ٹرین میں دیکھا تو چلّا اٹھے "دیکھو وہ دیکھو وہ ہے مسٹر گینڈی"! کسی نے پوچھا "کیا آپ ہی مسٹر گینڈسی ہیں؟"

میرابہن کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کے باوجود گاندھی جی کے ساتھ وہاں کے لوگوں کا بہت دوستانہ رویہ تھا۔ گاندھی جی نے مزدوروں اور مالکوں دونوں گروہوں سے باتیں کیں۔ اس کے بعد سامعین میں ایک آدمی کو یہ کہتے سنا گیا۔ "اب ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں، مسٹر گاندھی سے ملنا بڑی خوش قسمتی کی بات ہے" ایک دوسرے آدمی نے کہا "میں ایک بے روزگار ہوں، اگر میں ہندوستان میں ہوتا تو میں وہی بات کہتا جو مسٹر گاندھی کہہ رہے ہیں۔"

گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والے گاندھی جی تنہا ہندوستانی نہیں تھے لیکن کانگرس کے وہی تنہا نمائندے تھے اور ان چند لوگوں میں سے تھے جو کسی قسم کی خوشامد یا تکلّم بازی نہیں کر رہے تھے۔ ان کا لباس وہی تھا جو وہ پہلے پہنتے تھے۔ گھٹنوں تک کی لنگی اور اوپر سے چادر انھوں نے انگریزی فیشن کی نقل نہیں کی۔ جانے سے پہلے ایک شخص نے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ انگلستان میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے گاندھی جی پر لنگوٹی زیب نہیں دے گی۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا "جہاں تک لباس کا سوال ہے بہت سے لوگوں نے مجھے صلاح دی ہے لیکن یہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر میں انگلستان جاتا ہوں تو ایک نمائندے کی حیثیت سے جاؤں گا کسی اور حیثیت سے نہیں مجھے ویسا نہیں دکھنا چاہیئے جیسے مجھے انگریز دیکھنا چاہیں گے بلکہ ویسا دکھائی دینا چاہیے جیسے

ہندوستان کے ایک نمائندے کی حیثیت سے مجھے نظر آنا چاہیے۔ میں کانگرس کی نمائندگی کرتا ہوں جس حد تک وہ آدھے پیٹ کھانے والے اور قریب قریب ننگے کسانوں کی اور غریبوں کی نمائندگی کرتی ہے اور اگر میں زمینداروں، امیروں یا مالدار یا تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی نمائندگی کرتا ہوں تو اسی حد تک جس حد تک وہ اپنے کو غریبوں جیسا بنا پاتے ہیں اور ان کے مفاد کی حمایت کی خواہش رکھتے ہیں اس لیے میں نہ تو انگریزی لباس میں رہ سکتا ہوں اور نہ چمک دمک والے نہروؤں کی پوشاک میں ہم دونوں میں انتہائی گہرے تعلقات ہونے کے باوجود میرے لیے اُن کے جیسے کپڑے پہننا اتنا ہی مضحکہ خیز ہوگا جتنا اُن کے لیے لنگوٹی پہننا۔ جیسا میں ہوں اگر میں ویسا ہی انگریزوں کے سامنے نہیں جاتا تو سمجھا جائے گا کہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہوں اور ان کے ساتھ بدتہذیبی کا مجرم قرار دیا جاؤں گا۔"

جب شہنشاہ جارج پنجم سے ہاتھ ملانے کے لیے ہندوستانی نمائندے بکنگھم پیلس بلائے گئے تو گاندھی جی سے اشارتاً کہا گیا کہ وہ اس موقع پر صحیح درباری لباس پہن لیں لیکن انھوں نے کہدیا کہ میں تو اپنی روزمرہ والی لنگوٹی ہی میں جاؤں گا اگر یہ منظور نہیں ہے تو شاہی تقریب میں میری شرکت کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال وہ اپنے ہی لباس میں گئے لیکن جیسا کہ بدیس میں وہ اکثر کر لیا کرتے تھے انہوں نے کاندھے پر ایک بڑی شال ڈال لی تھی۔

گول میز کانفرنس میں گاندھی جی نے جو تقریر کی وہ سادہ ہونے کے باوجود پرزور تھی اس میں انھوں نے ہندوستان کے کروڑوں غریبوں اور ہزاروں سیاسی قیدیوں کے جذبات کی نمائندگی کی تھی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ اس وقت برطانیہ میں اور اس کانفرنس میں بھی کٹر اور رجعت پسند لوگ چھائے ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ دوسرے ہندوستانی نمائندوں کی زیادہ تر دلچسپی فرقہ وارانہ مسائل سے تھی نہ کہ اس بات میں جسے وہ زیادہ اہم سمجھتے تھے جیسے ہندوستان کے لیے آئین بنانا۔ گاندھی جی کے اس مشن کی ناکامی سے ملک میں مایوسی پیدا ہونا لازمی تھی۔

بہرحال گاندھی جی اس سفر سے یوں مطمئن رہے کہ انہیں بچوں کے ساتھ گھل مل کر بیٹھنے میں بڑا مزا آتا تھا وہاں چھوٹے بچے انہیں چاچا گاندھی کہتے تھے جس حصے میں گاندھی

جی کا قیام تھا۔ لندن کے اس حصّے میں ایک بچوں کا گھر (چلڈرنس ہوم) ہے وہاں رہنے والے بچوں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا اس میں انھوں نے کہا " ہم آپ کو سالگرہ کا ایک گیت سُناتا اور ایک تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں ہماری خواہش ہے کہ آپ اس موقع پر ہماری طرف سے ایک کیک قبول کریں۔ آپ مہربانی کرکے یہاں آئیں اور اپنی سال گرہ ہمارے ساتھ منائیں اس وقت ہم بینڈ باجا بجائیں گے اور طرح طرح کے گیت گائیں گے ــــ میری، اسٹینلی، پیٹر، جان، جین ایلس، جون برنارڈ، بیلی، فلس، ڈورین، ڈیوڈ کی طرف سے نیز دوسرے سب بچوں اور لوگوں کی طرف سے پیار اور پیار ہی پیار "

خط کے ساتھ ایک چھوٹی سی ٹوکری تھی جس میں اُون کے بنے دو کتّے، سالگرہ والی تین گلابی رنگ کی موم بتیاں، ایک ٹین کی طشتری، ایک نیلی پنسل اور کچھ مٹھائیاں تھیں۔

لندن میں قیام کے دوران گاندھی جی اس خط کا جواب نہ دے سکے اس لیے وہ بچوں کے بھیجے ہوئے کھلونے اور خط ساتھ لیتے آئے۔ ہندوستان میں واپس ہونے کے بعد وہ پھر گرفتار کر لیے گئے۔ گاندھی جی نے جیل سے بچوں کے خط کا جواب کچھ ہفتوں بعد لکھا انھوں نے جواب میں لکھا :-

" میرے پیارے ننھے دوستو !

میں اکثر تمھارے بارے میں سوچا کرتا ہوں اور ان خوبصورت جوابوں کے متعلق بھی جو تم نے ملاقات کے موقع پر تیسرے پہر کو دئے تھے۔ جب تک میں کنگس لے ہال میں رہا مجھے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ تم نے محبت سے جو تحفے میرے لیے بھیجے تھے ان کے لیے شکریہ کا ایک خط تمھارے پاس بھیج سکوں۔ یہ کام میں اب جیل سے کر رہا ہوں۔

میں نے خیال کیا تھا کہ تمہارے تحفے میں اپنے آشرم کے بچوں کو دے دوں گا لیکن میں آشرم پہنچ ہی نہ سکا۔

کیا یہ تمھارے لیے عجیب سی بات نہیں ہے کہ تمہیں جیل سے کوئی خط ملے؟ اگرچہ میں جیل میں ہوں لیکن میں قیدی کی طرح محسوس نہیں کرتا جہاں تک میرا خیال ہے میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ تم سب کو میرا پیار۔

تمھارا

جسے تم چاچا گاندھی کہتے ہو۔

گاندھی جی بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ایک نوجوان نے جو گاندھی جی کے ساتھ کام کرتا تھا بعد میں اپنے تجربات لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں ایک دن گاندھی جی نے وائسرائے کو انتباہ دیتے ہوئے ایک خط لکھا اور اسے بلڈنگ سے سکھانے کے فوراً ہی بعد ایک ہریجن لڑکی کو خط لکھنے لگے جو پانچ سو میل دور رہتی تھی اور اس خط میں دریافت کیا کہ تم نے اپنی زخمی انگلی پر آیوڈین لگائی یا نہیں۔

برطانیہ میں گاندھی جی اہم لوگوں سے ملنے کے علاوہ غریب بچوں اور مِل مزدوروں سے بھی ملے۔ وہاں وہ جن لوگوں سے ملے ان میں یہ لوگ تھے:۔ آئرلینڈ کے ڈرامہ نویس اور ناول نگار جارج برنارڈ شا جو ہندوستان کے اس لیڈر کو ایک پاک روح مانتے تھے، وزیراعظم لائڈ جارج، اداکار چارلی چیلین، مشہور دانشور گلورٹ مرے اور پارلیمنٹ کے متعدد ممبران۔ لندن میں رہنے والے کچھ ہندوستانیوں سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ جیسے ایک ہندوستانی صحافی فرینک مورس جو بعد میں ہندوستان کے صف اول کے اڈیٹروں اور سماجی مسائل پر اچھے لکھنے والوں میں شمار کئے جانے لگے۔ برطانیہ میں قیام کے دوران گاندھی جی نے آکسفورڈ یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طالب علموں اور ٹیچروں کے سامنے تقریریں کیں۔ اس کے بعد وہ پروگرام کے مطابق ہندوستان کے لیے روانہ ہوگئے۔

جب گاندھی جی لندن سے چلے تو ان کے ساتھ دو موٹے تازے انگریز خفیہ پولیس کر دیئے گئے۔ انہیں صرف پیرس تک گاندھی جی کے ساتھ جانا تھا لیکن انھیں ان سے اتنا لگاؤ ہوگیا کہ انھوں نے برنڈسی تک ساتھ رہنے کی اجازت لے لی اور وہاں گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کو اٹلی کے ایک جہاز پر آرام سے بٹھانے کے بعد ان سے رخصت ہوئے۔

راستے میں گاندھی جی عالم گیر شہرت رکھنے والے فرانسی ناول نگار رومیں رولاں سے سوئزرلینڈ میں ملے۔ دونوں میں بڑی دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ بہت سی باتوں کے متعلق دونوں کی رائے یکساں ہے۔ وِلے نوو میں گاندھی جی کا بڑا احترام کیا گیا۔ انھوں نے وہاں کئی عام جلسوں میں تقریریں کیں اور لوجا اور جنیوا کے مشہور شہروں میں ان کا مشغول پروگرام رہا۔

جو لوگ ان سے ملنے آتے وہ ان سے طرح طرح کے سوال کرتے لوگوں نے اُن کے

امن پسند خیالات اور معاشی اصولوں کا خیر مقدم کیا لیکن اخباروں نے ان کی مخالفت کی جیسا کہ انگلینڈ میں زیادہ تر اخباروں نے کیا تھا۔ گاندھی جی کو ان کی مخالفت پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اور انھوں نے ان کی مخالفت خندہ پیشانی سے برداشت کی۔

گاندھی جی روم میں بھی ٹھہرے اور وہاں کیتھالک گرجا کی آرٹ گیلریوں اور سسٹن چیپل کو دیکھا وہ اس سے بہت متاثر ہوئے حالانکہ انھیں آرٹ سے زیادہ دلچسپی کبھی نہیں رہی۔ اور نہ انھوں نے اس کا گہرا مطالعہ کیا۔ مذہبی پیشوا پوپ نے گاندھی جی سے ملنے سے انکار کردیا لیکن اٹلی کے ڈکٹیٹر بینی ٹو مسولینی نے ان سے ملاقات کی۔

مسولینی سے ان کی ملاقات صرف دس منٹ تک رہی لیکن اتنی ہی دیر میں گاندھی جی نے دیکھ لیا کہ اٹلی کا یہ ڈکٹیٹر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے سولہ آنے ہتھیاروں پر بھروسہ کرتا ہے۔

مسولینی سے مل کر لوٹنے پر گاندھی جی نے کہا ” اُن کی آنکھیں بلّی جیسی ہیں۔ وہ ہر سمت دیکھتی رہتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چکر لگا رہی ہوں۔ جس طرح چوہا صرف ڈر کی وجہ سے سیدھا بلّی کے منہ کی طرف دوڑ جاتا ہے اسی طرح ان سے ملنے والا ان کی آنکھوں کے خوف کا شکار ہو جاتا ہے۔

” میں تو ان کے رعب میں آنے والا تھا نہیں لیکن میں نے دیکھا کہ انھوں نے اپنے چاروں طرف چیزیں اس طرح سجائی تھیں کہ ملنے والا آسانی سے ان کے رعب میں آسکتا تھا “ مسولینی کے دفتر کو جانے والی گیلری میں طرح طرح کے ہتھیار سجائے گئے تھے۔ دفتر کافی بڑا تھا اور اس کی دیواروں پر بھی ہتھیار لٹک رہے تھے۔

اس ملاقات میں گاندھی جی کے سکریٹری پیارے لال ان کے ساتھ تھے بعد کو انہوں نے اس ملاقات کا حال لکھا جس میں انہوں نے بتایا:۔

فسطائی لیڈر نے مذاقیہ انداز میں گاندھی جی سے پوچھا :۔ ” کیا آپ اہنسا کے ذریعہ ہندوستان کو آزاد کرانے کی امید رکھتے ہیں اور میں نے جو فسطائی فوجی حکومت قائم کی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟ “

باپو نے نہایت واضح الفاظ میں بے دھڑک کہا کہ ” جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں میرے نزدیک آپ کا یہ سارا کام بالو پر محل بنانے جیسا ہے “

اٹلی کے ایک اخبار نے گاندھی جی کے نام سے ایک جھوٹی ملاقات کا حال شائع کر دیا اس میں کہا گیا کہ ہندوستان لوٹنے پر پھر تحریک سول نافرمانی شروع کردی جائے گی گاندھی جی نے لندن فوراً تار بھیجا اور کہا یہ بات بالکل غلط ہے لیکن کئی برطانوی اخباروں اور لیڈروں نے گاندھی جی کے بجائے اٹلی کے اخبار کی بات ہی سچ سمجھی - اس طرح سنسنی خیز اخباری افواہ سے کانگرس اور انگریزی حکومت کے درمیان تناؤ اور بڑھ گیا۔

۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی بمبئی واپس آ گئے۔ انگلستان سے لوٹنے کے فوراً بعد حکومت برطانیہ نے انہیں پھر گرفتار کر لیا۔ وہ پھر اپنے جانے پہچانے برودا جیل لے جائے گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کانگرس کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اس طرح گاندھی ارون سمجھوتہ ناکام ہوگیا اور تحریک سول نافرمانی پھر سے شروع کر دی گئی۔ اگر حکومت برطانیہ جلد بازی سے کام لے کر معاملے کو بگاڑ نہ دیتی تو تحریک ابھی شروع کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ حکومت اور کانگرس کے درمیان بڑھتے ہوئے تناؤ، دہشت پسندوں، انتشار کے حامیوں اور دوسرے عدم تشدد کے نہ ماننے والے انقلابیوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستانی وطن پرستوں اور برطانی حاکموں کے بیچ اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔

ملک کے کچھ حصوں میں انگریزی حکومت کے جبر و تشدد کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ یہ ہمیشہ بلا وجہ نہیں ہوتا تھا لیکن دکھ کی بات یہ تھی کہ حکومت نے جو قدم تشدد کے قائل لوگوں کے خلاف اٹھائے وہی قدم اہنسا (عدم تشدد) کے حامیوں کے خلاف اٹھائے۔ جواہر لال نہرو اور دوسرے لیڈر پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اور کانگرس نیز دوسری آزادی کی جماعتیں غیر قانونی قرار دے گئیں۔ کل ہند کانگرس کمیٹی کا روپیہ ضبط کر لیا گیا۔ اور مخصوص قانون کے ذریعہ اس کی عمارت بھی لے لی گئی ظاہر ہے کہ حکومت کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ تحریک کو کچل دے اور اسے پھیلنے سے روک دیے۔ کانگرس کی جائداد نیلام کر دی گئی۔ سابر متی آشرم کی بھی کچھ چیزوں کا یہی حال ہوا۔ کئی زمینیں جو ضبط کی گئی تھیں وہ بیچ دی گئیں۔

حکومت کے ظلم و جبر کا دوسرا شکار پریس ہوا۔ پریس قانون کے ماتحت اخباروں کو ضمانتیں دینی پڑیں یعنی قانون نہ توڑنے کی گارنٹی کے طور پر ایک رقم جمع کرنی ہوتی تھی اگر کسی اخبار نے کوئی ایسی چیز چھاپی جو حکومت کو پسند نہیں آئی تو وہ رقم ضبط کرلی جاتی اور اس کی جگہ نئی رقم جمع کرنی پڑتی اس طرح اخبارات کافی مشکلات میں ڈالا جاتا اپنی پالیسی

کا پرچار کرایا جاتا اور آزاد رائے ظاہر کرنے سے روکا جاتا۔

۱۹۳۲ء کے وسط تک پریس قانون کے ماتحت ۱۰۹ صحافیوں اور ۹۸ اخباروں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ کانگرس کی حمایت میں کچھ چھاپنا یا حکومت پر کسی طرح کی نکتہ چینی کرنا جرم مانا جاتا تھا۔ کچھ اخبارات کو تو صرف اس بات پر سزا دی گئی کہ انہوں نے گاندھی جی اور اُن کے حامیوں لیڈروں کی تصویریں چھاپی تھیں۔

اس بار یرودا جیل میں گاندھی جی کے ساتھ ان کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی اور سردار پٹیل تھے۔ گاندھی جی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنا روزمرّہ کا پروگرام بدستور جاری رکھیں گے۔ وہ عبادت اور کتائی کرتے، خطوں کا جواب دیتے، اپنے کچھ کپڑے دھوتے، خوب پڑھتے، علم نجوم کا بھی مطالعہ کرتے۔ مہادیو بھائی نے لکھا ہے کہ گاندھی جی جو اپنا فرض سمجھتے اسے جاری رکھنے کے لیے ان کا اصرار کبھی کبھی انتہا کو پہونچ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ یرودا جیل میں گاندھی جی کی کہنی اور انگوٹھے میں بہت درد ہونے لگا۔ لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ وہ کتائی جاری رکھیں گے۔ وہ دس سال سے روزانہ کتائی کرتے چلے آئے تھے۔ وہ دن بھر میں ۳۷۵ تار سوت کاتتے تھے یہ کوٹا وہ جیل میں بھی پورا کرتے رہے۔

۱۹۳۲ء کے شروع میں حکومت نے نو مہینوں کے اندر تحریک سول نافرمانی کے سلسلے میں ۶۱،۵۵۱ لوگوں کو سزائیں دیں۔ سال کے آخر میں حکومت نے یہ سمجھا کہ اس نے تحریک دبا دی پھر بھی اس نے پابندی لگانے والے قانون جاری رکھے۔ وائسرائے ولنگڈن گاندھی جی کو سمجھ ہی نہیں پائے تھے وہ ان کے متعلق پہلے ہی سے ایک رائے قائم کر چکے تھے وہ گاندھی جی کو اور ان کے اردگرد کے لوگوں کو صرف سیاسی آدمی مانتے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کی اخلاقی طاقت کبھی محسوس نہیں کی اور نہ ان کے مذہبی نقطۂ نظر ہی سمجھ سکے۔

17- ہریجنوں کے مسیحا

بہت سے امریکیوں کی مذہبی زندگی میں اب بھی برت کی ایک خاص جگہ ہے لیکن اُن کے سیاسی لیڈر اس کا استعمال اپنی غلطیوں کی سزا کے طور پر یا اپنی تحریک کو عالم گیر

مقبولیت دینے کے لیے شاذونادر ہی کرتے ہیں۔ مگر ایشیا میں اس کا رواج عرصے سے چلا آرہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی اس کا چلن بہت دنوں سے ہے۔

غذا کے سلسلے میں تجربات کرنے کا رجحان گاندھی جی میں عرصے سے پایا جاتا تھا۔ جنوبی افریقہ کے ابتدائی زمانے میں وہ برت میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کے دوران انھوں نے محسوس کیا کہ عدمِ تشدد کے قائل مجاہد کو ہر طرح کے کنٹرول کے لیے تیار رہنا چاہیے حتیٰ کہ زبان کی لذت پر کنٹرول کے لیے بھی۔

اپنی خودنوشت سوانح عمری میں انھوں نے لکھا ہے کہ "مجھے اچانک خیال آیا کہ برت کو ضبط و پابندی کے بجائے لطف و مسرت کا بھی اہم ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کھانے سے متعلق تجربات شروع کردیے (بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ نہ کھانے کے متعلق یا محدود غذا کے متعلق) گاندھی جی کا خاندان مذہبی تھا، اس لیے وہ لوگ سب سبزی خور تھے۔ گاندھی جی نے صرف پانی پی کر زندگی بسر کرنے کا بھی تجربہ کیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی خوشی سے بھوکے رہنے کی آزمائش کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیا۔

لہو و لعب سے دور رہنے والا شخص اس بُری عادت سے تو بچ جاتا ہے لیکن دل میں دبی ہوئی خواہش سے نہیں بچ پاتا۔ اس سے تو اسے نجات خدا کے جلوے کے بعد ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

اس پس منظر میں گاندھی جی کا کبھی کبھی برت رکھنا سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ یہ ایک روحانی طریقہ تھا جس کے ذریعے سے ایک طاقت ور حکومت کو اس کی غلط کارروائیوں کی طرف دھیان دلایا جاسکتا تھا۔

اس لیے جب ۱۳ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اخباروں میں شائع ہوا کہ گاندھی جی نے مرن برت رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو وہ ہندوستان کے لیے کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں تھا۔ برت ۲۰ ستمبر کو شروع کیا گیا۔ یہ نئے آئین کی اس دفعہ کے خلاف تھا جس کے ذریعہ ہریجنوں کو جداگانہ انتخاب کی اجازت دے دی گئی تھی۔ انھوں نے اس دفعہ کو نفاق ڈالنے

والی دفعہ قرار دیا کیونکہ اس کے مطابق ہریجنوں کا شمار الگ کیا جانے والا تھا یہ ایک ایسی کاروائی تھی جس سے پس ماندہ لوگوں کا کوئی بھلا ہونے والا نہیں تھا۔ انھوں نے گول میز کانفرنس میں اس تجویز کی مخالفت کی تھی اور اس کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دینے کی آگاہی دی تھی اب مرن برت رکھ کر وہ اسے پورا کر رہے تھے۔

برطانی لیڈروں نے جن میں لیبر پارٹی کے لیڈر رمزے مکڈانلڈ بھی شامل تھے۔ (جو آگے چل کر برطانیہ کے وزیراعظم ہوئے) یہ سمجھا کہ یہ برت ذاتی شہرت حاصل کرنے کے لیے سیاسی اقدام ہے۔ برت کو اس نقطہ نظر سے دیکھے جانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ برطانی لیڈر گاندھی جی کو بالکل سمجھ نہیں سکے ۔ برت کے متعلق ایسی رائے قائم کرتے وقت اس حقیقت کو بھی بالکل نظرانداز کیا گیا کہ گاندھی جی کافی عرصے سے چھوت چھات کی مخالفت کرتے چلے آئے تھے اور مختلف طریقوں سے ہری جنوں کی مدد کرتے رہے تھے۔ گاندھی جی کی زندگی کے حالات لکھنے والے ایک مصنف نے لکھا ہے" ان کی روح کی تکلیف کو ظاہر کرنے کے لیے برت ہی ایک واحد ذریعہ تھا۔"

۲۰ ستمبر ایک قومی دن کے طور پر منایا گیا اس دن پورے ملک میں لوگوں نے برت رکھا اور عبادت کی اور اچھوتوں کے ساتھ زیادہ اچھا برتاؤ کیا۔ ہریجنوں اور پس ماندہ لوگوں کی کانفرنس طلب کی گئی تاکہ رائے دہندگی کی قابل قبول تجویز تیار کی جائے اس میں ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیدکر بھی شامل ہوئے وہ اونچے درجے کے وکیل تھے اور ان کی تعلیم امریکہ میں ہوئی تھی۔ وہ ہریجنوں کے ہمدرد تھے اور خود بھی اچھوت تھے وہ بھی جداگانہ انتخاب چاہتے تھے۔

اگلے دن گاندھی جی کو یرو داجیل کے صحن میں لے جایا گیا جہاں وہ دن میں ایک درخت کے نیچے سردار پٹیل، سروجنی نائیڈو اور مہادیو ڈیسائی کے ساتھ رہے۔ کستور با کو بھی اُن کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ کانفرنس نے گاندھی جی سے ملنے کے لیے کچھ نمائندے بھیجے۔

لوگوں سے ملتے رہنے اور اپنے روزانہ کے پروگرام پر برابر عمل کرتے رہنے سے انہیں تیزی سے کمزوری محسوس ہونے لگی۔ ڈاکٹروں کے ایک گروہ کی رائے تھی کہ برت کی وجہ سے جلد ہی ان کی حالت خطرناک ہو جائے گی۔ کانفرنس میں اس صورت حال پر غور کیا گیا

اور آخر میں ایک تجویز پر اتفاق رائے ہوگیا جو پونا ایکٹ کے نام سے مشہور ہے۔

لیکن گاندھی جی اپنا برت اس وقت تک توڑنے والے نہیں تھے جب تک لندن میں برطانی حکومت اس مجوزہ قانون کی دفعات کو مان نہ لے۔ اس مجوزہ قانون پر پہلے تو رمزے میکڈانلڈ، لارڈ لوتھین اور وزیر ہند سموئل ہور نے غور کیا جب یہ تینوں اس پر راضی ہوگئے۔ تب برطانی کابینہ نے اپنی منظوری دے دی۔ اس سمجھوتے کے مطابق سرکاری منصوبے کی جگہ ایک دوسرا انتخابی منصوبہ منظور کیا گیا جس سے نفاق پیدا کرنے والا سرکاری انتخابی منصوبہ ختم ہوگیا۔ گاندھی جی کے اس کام سے چھوت چھات کی لعنت پر ایک نئی ضرب لگی۔

اس کامیابی سے حوصلہ پاکر گاندھی جی نے صحافت کے میدان میں بھی آگے قدم رکھا اور اور 'ہریجن' نام کا ایک نیا ہفتہ وار نکالنا شروع کیا تاکہ اس کے ذریعہ چھوت چھات کے خلاف اپنی تحریک آگے بڑھا سکیں۔ اس میں جو کچھ شائع ہوتا اس کا اکثر حصّہ خود گاندھی جی لکھتے۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ سمجھایا کہ 'اچھوت' لفظ ہی ٹھیک نہیں۔ انہیں ہریجن کہنا چاہیے کیونکہ وہ 'خداوندی خاندان' کے ہیں۔ اونچی ذات کے لوگ ہریجنوں کے ساتھ جو برا برتاؤ کرتے اس کی وہ کھل کر مذمت کرتے تھے اس کام کے لیے 'ہریجن سیوک سنگھ' نام کا ایک قومی ادارہ قائم کرنے میں انھوں نے پوری دلچسپی لی۔

ان باتوں کے باوجود وہ اپنے اصولوں پر عمل درآمد کی رفتار سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک نیا برت رکھا۔ اکیس۲۱ دن کا 'تزکیہ نفس' والا یہ برت انھوں نے ۸ رمئی ۱۹۳۳ء کو ایک نجی گھر میں شروع کیا۔ جہاں وہ قیام کے لیے لے جائے گئے تھے۔ اس کے بعد یکم اگست کو وہ پھر گرفتار کر لیے گئے اور یرودا جیل بھیج دیے گئے۔ تین دن بعد رہا کر دیئے گئے۔ اور پھر ۷ راگست کو پکڑ لیے گئے۔ انہیں ایک سال کی سزا دی گئی ۱۶ راگست کو انھوں نے جیل میں پھر برت شروع کیا۔ انھوں نے یہ برت اس دخل اندازی کے خلاف رکھا جو چھوت چھات مٹانے کی تحریک میں کی گئی تھی۔

اس طرح برابر برت رکھنے کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی۔ اور وہ رہا کر دیئے گئے۔ رہائی کے بعد انھوں نے ہریجنوں کو اوپر اٹھانے کا کام پھر شروع کر دیا۔ ستمبر کے

مہینے میں وہ ہندوستان کے وسط میں واقع وردھا کے مقام پر چلے گئے اور سابرمتی آشرم ہریجن تنظیم کو دے دیا۔

انھوں نے ہریجنوں کی حالت سدھارنے کی غرض سے ملک کا دورہ کیا۔ اس دورے کے دوران انھوں نے بہار کے زلزلے سے متاثر ہونے والے لوگوں کی امداد کے لیئے سامان بھیجنے کا کام بھی کیا۔ یہ زلزلہ جنوری ۱۹۳۲ء میں آیا تھا اور اس میں زبردست جانی ومالی نقصان ہوا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے وسط تک گاندھی جی نے ۱۲۵۰۰ میل کا سفر کیا۔ اور اس دورے میں انھوں نے زلزلے کے مصیبت زدوں کے لیے ہر طرح کے اور ہر عمر کے لوگوں سے آٹھ لاکھ روپے جمع کر لیے۔

پچھلے دورے کے دوران گاندھی جی ایک مرتبہ کسی جلسے سے واپس ہوئے تو راستے میں ان کی موٹر سے ایک آدمی جس کا نام پدم سنگھ تھا دب گیا اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی گاندھی جی جب اسے اسپتال دیکھنے گئے تو پدم سنگھ نے ان سے کہا۔

" اگر میں مر جاؤں تو میری خواہش ہے کہ آپ میرے بیٹے کو آشیرواد (دعا) ضرور دیں۔

اس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا " میں وعدہ کرتا ہوں کہ یا تو میں اسے آشرم میں لے جاؤں گا جہاں اس کی دیکھ بھال کی جائے گی اور اسے تعلیم بھی دی جائے گی یا اس کے لیے اس کے گھر پر ہی ضروری انتظام کر دیا جائے گا۔ جیسا آپ چاہیں کر دیا جائے"

مرنے والے پدم سنگھ نے منّت کرتے ہوئے کہا " نہیں میں یہ کچھ نہیں چاہتا میں تو صرف آپ کا آشیرواد چاہتا ہوں"

پدم سنگھ کے مرنے کے بعد گاندھی جی نے " ہریجن سیوک " میں لکھا :۔ مجھے چاہیے تھا کہ یا تو میں پیدل چلنے کو کہتا یا جب تک ہم لوگ بھیڑ پار نہ کر لیتے اس وقت تک کار بہت دھیرے دھیرے چلائی جاتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ موٹر پر برابر سوار ہونے سے میرے احساس میں کمی آگئی تھی اور چونکہ اب تک کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا تھا اس لیے پیدل چلنے والوں کی حفاظت کے متعلق میرے دماغ میں لاپروائی آگئی تھی اگرچہ یہ لاپروائی غیر شعوری طور پر تھی پھر بھی ناقابلِ معافی تھی۔ میں خود اچھی طرح نہیں جان سکا کہ پاگل کی طرح میرا اس طرح ملک بھر میں گھومنا ہمیشہ مفید ہوتا ہے یا نہیں"

۱۹۳۴ء کے دورے کے موقعے پر سناتنی ہندوؤں نے گاندھی جی کے خلاف مظاہرے کیے۔ جلسوں میں ان سے اُلٹے سیدھے سوال پوچھے، شور و غل مچایا، ان پر جملے بازی کی اور ان کے کچھ جلسوں کو درہم برہم کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ جون میں جب وہ پونا واپس آئے تو ان کی پارٹی پر بم پھینکا گیا جس سے ان کے سات ساتھی زخمی ہو گئے لیکن گاندھی جی بالکل محفوظ رہے۔

اس سال گاندھی جی نے تحریک سول نافرمانی بالکل بند رکھی انہوں نے کہا میں اب تنہا اس کا علمبردار رہوں گا ان کے لیے یہ سیاسی نہیں بلکہ ایک اخلاقی فیصلہ تھا۔

گاندھی جی نے کانگرس کی ابتدائی ممبری سے بھی استعفا دے دیا۔ اس تحریک کے سلسلہ میں کانگرس کے لگ بھگ (۹۸،۰۰۰) ممبر جیل گئے تھے۔ تحریک سول نافرمانی کو کسی معنی میں بھی ناکام نہیں کہا جا سکتا۔

18- جنتا کے پیارے

ہندوستان کے دیہی عوام نے گاندھی جی کو محبت سے کئی نام دے رکھے تھے ان میں سے دو تھے 'باپو' اور 'باپو جی'، لیکن دیہات کے زیادہ تر لوگ انھیں 'مہاتما' یا 'گاندھی جی' کہا کرتے تھے۔

گاندھی جی کو خطابوں کا شوق نہیں تھا اور 'مہاتما' کہلانا تو انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ یہ وہ خطاب ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں برابر کچھ لوگوں کو دیا جاتا رہا ہے لیکن گاندھی کے ساتھ اس کا اتنا زیادہ استعمال ہوا کہ مغربی ہندوستان میں بہت سے لوگ اسے گاندھی کے نام کا پہلا لفظ سمجھنے لگے۔

مہاتما کا لفظ تو ہندوستان کے قدیم ادب میں اُپنشدوں میں ملتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور جب گاندھی جی کے آشرم گئے تھے تو ان کے لیے 'مہاتما'، کا لفظ انہوں نے سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔

اگرچہ لوگ انہیں مہاتما اور مہاتما جی کہتے تھے لیکن انہوں نے خود اس خطاب

کا کبھی خیر مقدم نہیں کیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اس کے بارے میں اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا :۔" بچارے مہاتما کو تو اس کی قسمت پر چھوڑے دیتا ہوں۔ اگرچہ میں حکومت سے تعاون کرنے والا آدمی ہوں لیکن میں بڑی خوشی سے ایسے قانون کو منظور کر لوں گا جس کے ذریعے مجھے مہاتما کہنے اور میرے پاؤں چھونے کو جرم قرار دیا جائے "

ایک اور موقعے پر انہوں نے لکھا :۔" ہمارے ملک میں پہلے ہی سے کافی غلط عقیدت مندی پائی جاتی ہے۔ گاندھی کی اگر پوجا کی جانے لگی تو یہ سلسلہ اور بڑھے گا اس لیے اس کی جتنی مخالفت کی جائے کم ہے۔ ذاتی طور پر ایسی عقیدت پر مجھے گھن معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شخص کے بجائے اس کے اعمال اور کردار کی قدر کی جانی چاہیئے۔

۱۹۴۰ء میں انھوں نے لکھا :۔" کسی کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ گاندھی کا پیرو ہے۔ اگر میں خود اپنا پیرو ہو جاؤں تو یہی کافی ہے "

میں نے خواب میں بھی کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں ' مہاتما ' ہوں اور دوسرے لوگ ' الپ آتما ' ہیں۔ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے ہم سب برابر ہیں ـــــ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی سب ایک ہی خدا کو ماننے والے ہیں "

گاندھی کی زندگی کے آخری دنوں میں لوگ انہیں عام طور پر ' گاندھی جی ' کہنے لگے تھے یہ بھی پیار بھرا نام ہے کیونکہ جی کے معنی احترام اور پیار کے ہوتے ہیں۔ آج بھی وہ اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں عوام ان کو دل و جان سے چاہتے تھے اور ان کی بھی ہر سانس جنتا کی بھلائی کے لیے چلتی تھی۔

ملک کے عام لوگوں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ رہتا تھا اس کی ایک جھلک ایک نائی کے ساتھ ان کے برتاؤ میں نظر آتی ہے۔ اس کا پتہ اس وقت چلا جب اس کی کتاب کے ایک مصنف کو اس نائی نے گاندھی جی کے ساتھ اپنی تصویر اور ان کے ہاتھ کی لکھی تحریر دکھائی یہ فوٹو ۲۳ر نومبر ۱۹۳۹ء کو لیا گیا تھا جب گاندھی جی کملا نہرو میموریل اسپتال کا سنگِ بنیاد رکھنے کا الہ آباد گئے تھے وہ وہاں نہرو خاندان کی قیام گاہ آنند بھون میں ٹھہرے تھے۔

نہرو خاندان کے لیے گاندھی جی سیاسی گرو اور مشیر ہی نہیں تھے بلکہ اُن کی حیثیت بزرگ خاندان کی سی تھی اکثر موقعوں پر نہرو خاندان کے لوگ اُن سے مشورہ لیا کرتے تھے اور اُن کے مشورے کی بڑی قدر کرتے تھے۔ گاندھی جی نے جواہر لال نہرو کی

اہلیہ شریمتی کملا نہرو سے وعدہ کیا تھا کہ الہ آباد میں غریبوں کے لیے ایک بڑا اسپتال بنوانے کی ان کی تمنا کو پورا کیا جائے گا۔ کملا جی کے انتقال کے بعد گاندھی جی نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اسی کا سنگ بنیاد رکھنے وہ الہ آباد گئے تھے۔

الہ آباد میں انہیں بال بنوانے کی ضرورت ہوئی تو ان کے بال بنّی لال نام کے ایک نائی نے بنائے۔ جب گاندھی جی بال بنوا رہے تھے تو ایک سکھ ان کے پاس جا کر پنجاب کے لوگوں کے دکھ کی داستان سنانے لگا۔ نائی نے بتایا کہ گاندھی جی نے سکھ کی باتیں غور سے سنیں اور وعدہ کیا کہ لاہور آکر لوگوں سے ملوں گا۔ اس وقت ان کے پاس ایک چادر اور کچھ اخبار رکھے تھے۔

بال بنوانے کے بعد گاندھی جی نے نائی کو ایک چھوٹی سی تحریر لکھ کر دی جسے ہندوستان میں سرٹیفکٹ اور مغربی ملکوں میں سفارشی خط کہا جائے گا۔ اس میں لکھا تھا:-

" نائی بنّی لال سے پوچھا گیا کہ گاندھی جی سے ایسی تحریر اسے کیسے مل گئی تو اس نے کہا کہ مہاتما کے بال بنانے کا موقع ملنا اس کی بڑی خوش قسمتی تھی۔ پھر اس نے بتایا کہ " میرے پاس کھادی کے کپڑے نہیں تھے تو جلدی سے شری شیو دیال اوپادھیانے جو اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کے پرائیویٹ سکریٹری تھے مجھے سلے سلائے کھادی کے کپڑے دیئے اور اس بڑے لیڈر کے بال بنانے کے لیے میں نے وہ کپڑے پہن لیے۔ گاندھی جی مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے " ارے آ گیا تو اچھا بال بناتا ہے۔

سیما نے نائی کی چترائی یہ تعریف سن کر جاگ اٹھی اور اس نے کہا اگر مہاتما جی میرے بارے میں آپ کی یہ رائے ہے تو لکھ کر ایک سرٹیفکٹ دے دیجئے گاندھی جی نے کہا جب تم اپنا کام اچھی طرح کرتے ہو تو تمہیں کسی سرٹیفکٹ کی ضرورت نہیں ہے لیکن تجارت کے نقطۂ نظر سے نائی گاندھی جی سے بڑا بنیا تھا۔ اس لیے چند سطریں لکھنے کی درخواست کرتا رہا تب گاندھی جی نے آنند بھون کے لٹرپیڈ پر اوپر والی تحریر لکھ کر دے دی۔

بنّی لال سرٹیفکٹ گھر لے گیا اور بڑے فخر کے ساتھ بہت سے لوگوں کو دکھایا بعد میں اسے پتہ چلا کہ گاندھی جی کے ساتھ کسی نے اس کی تصویر بھی لی تھی۔

بال بناتے وقت بنّی لال کو کچھ دقت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ کپڑے مانگے کے تھے۔ اور اس کے فٹ نہیں تھے گاندھی جی یہ بھانپ گئے اور پوچھا۔ " کیا تم کھادی ہمیشہ

پہنتے ہو ؟"

پنی لال سٹپٹا گیا اس نے سچ بات کہہ دی کہ یہ کپڑے مانگے کے ہیں اور میں ہمیشہ کھادی نہیں پہنتا ہوں۔ سچ بات کہنے پر گاندھی جی خوش ہوئے۔

پنی لال سے پوچھا گیا کہ گاندھی جی سے بال بنوائی کے کتنے پیسے ملے تھے۔ اس نے بتایا کہ نہرو جی کی ہدایت پر اسے دو روپے دئے گئے تھے۔

پنی لال نے یہ بھی بتایا کہ بال بنواتے وقت باپو اس سے ہنسی مذاق کرتے رہے اور اس کے بال بچوں کی خیریت بھی پوچھتے رہے۔

اس فوٹو اور تحریر کو پنی لال ایک خزانے سے بھی زیادہ قیمتی خیال کرتا ہے اور انھیں اپنی دُکان کی زینت سمجھتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک آدمی ایک مرتبہ فوٹو اور سرٹیفکٹ کے لیے سو روپے دینے لگا لیکن وہ کسی قیمت پر دینے کے لیے راضی نہیں ہوا اس نے انھیں اپنی اولاد کے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔

نائی کے ساتھ گاندھی جی کی خوش مزاجی کوئی نئی بات نہیں تھی وہ اکثر مذاق ہنسی کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اُن کے انتقال کے بعد انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ 'نہایت خوش مزاج آدمی تھے' وہ اکثر ہنستے رہتے تھے ایک اور ملنے والے نے کہا کہ "اگر آپ اس آدمی کے ساتھ پانچ منٹ بھی رہیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ ہنسے بغیر نہیں رہتا"

جب گاندھی جی 75 سال کے ہوئے تو ایک دوسرے ملاقاتی نے ان کے بارے میں لکھا :- "لیکن میرا خیال ہے کہ جو اُن سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ گاندھی جی میں کشش ان کی خوش مزاجی کی وجہ سے محسوس کرتے ہیں"

ان کی خوش مزاجی کی واضح مثال اس وقت ملی جب وہ انگلستان گئے تو تھوڑے وقت کے لیے اسکاٹ لینڈ بھی ان کا جانا ہوا۔ وہ آدھی دھوتی پہنے اور شال اوڑھے تھے۔ انھوں نے اسکاٹ لینڈ کے ایک صاحب کو دیکھا جو اوپر سے نیچے تک لمبے چوڑے کپڑے پہنے تھے انھوں نے اُن سے پوچھا جو آپ لباس پہنے ہیں اس کا نام کیا ہے ؟

اسکاٹ لینڈ کے ان صاحب نے کہا کہ اسے "پلس فورس" کہتے ہیں۔
گاندھی جی کی دھوتی کو دیکھ کر انھوں نے پوچھا "اور آپ جو پہنے ہیں اسے کیا کہتے ہیں؟

مہاتما نے ہنستے ہوئے جواب دیا اسے " مائی نس فورس" کہا جاتا ہے۔

19۔ نمونے کا گاؤں

جب گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے تو وہاں ایک خوبصورت نوجوان اُن سے ملا۔ اس نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی وہ رنگین ٹائی لگائے ہوئے تھا۔

اس وقت ہندوستان کے مشہور صحافی فرینک مورس بھی گاندھی جی پاس بیٹھے تھے انہوں نے کہا ہے کہ اس ' خوبصورت اور بنے ٹھنے نوجوان' نے شان کے ساتھ گاندھی جی سے پوچھا:۔

" مہاتما جی ملک کی مدد کے لیے میں کیا کرسکتا ہوں؟ " ذرا دیر اس کی طرف دیکھنے کے بعد گاندھی جی نے جواب دیا۔۔ " میں صلاح یہی دوں گا کہ تم گاؤں میں جاؤ، وہاں بہت کام کرنا ہے۔ تم گاؤں والوں کے سامنے صفائی کا ایک نمونہ پیش کرو، وہ لوگ اس کے بارے میں تو کچھ جانتے نہیں پائخانہ صاف کرنے اور بھنگی کا کام کرنے کے لیے تمہیں تیار رہنا چاہیئے۔ "

مورس لکھتے ہیں کہ " گاندھی جی کی یہ بات سن کر وہ نوجوان سٹپٹا گیا "

گاندھی جی نے آکسفورڈ کے طالب علم سے جو کچھ کہا تھا۔ اس پر اس زمانے میں وہ بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے تھے گھریلو دھندوں کے ذریعے گاؤں کی ترقی اور وہاں کے لوگوں کی مدد کے کام میں وہ خود لگ جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک کل ہند دیہی صنعت سنگھ قائم کیا جس کے متعلق کانگرس نے تجویز بھی منظور کی اس کا مقصد غریبی دور کرنا تھا۔

برسوں سے گاندھی جی چرخے پر زور دیتے چلے آرہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ امید کرتے تھے کہ، چرخے سے کچھ حد تک بے روزگاری دور ہو سکے گی یا لوگوں کی الگ سے کچھ آمدنی ہوگی اب وہ اس مسئلے کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ چرخے اور دیہی صنعتوں کو پھر سے زندہ کرنا اس کا حل تھا۔ گاندھی جی یہ کام شروع کر کے ایک

بڑے کام کی ذمہ داری اپنے سر لے رہے تھے۔ کیونکہ آج کی طرح پہلے بھی ہندوستان کے زیادہ تر لوگ دیہی علاقے میں رہتے تھے۔ انھوں نے ایک نمونے کا گاؤں بنا کر اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔

تجربے کے لیے گاندھی جی نے سیگاؤں نام کا ایک گاؤں پسند کیا یہ ہندوستان کے تقریباً بیچ میں وردھا کے پاس ایک چھوٹا غیر ترقی یافتہ گاؤں تھا۔ جس کی آبادی چھ سو تھی۔ وہاں وہ ایک کوٹھری والی جھونپڑی میں رہتے تھے جو جاڑوں میں سرد اور گرمیوں میں گرم رہتی۔ سیگاؤں ہندوستان کا ایک معمولی، گندہ گاؤں تھا نہ وہاں پکی سڑک تھی نہ ڈاکخانہ اور نہ کوئی دکان وہاں کے لوگ بے پڑھے لکھے تھے اور ان میں سے اکثر کو پیچش یا ملیریا کی شکایت تھی (یا پہلے ہو چکی تھی) گاندھی جی وہاں جا کر خود بھی بیمار پڑ گئے، وہ وہاں اکیلے ہی رہتے تھے مگر کچھ دنوں بعد ان کے کچھ ماننے والے ان کے ساتھ آ کر رہنے لگے اور آگے چل کر تو ان کے اصولوں سے متاثر ہو کر یورپ کے لوگ ایک کے بعد ایک آ کر گھیرنے لگے۔

جب تجربے والے گاؤں کی شکل میں سیگاؤں بڑھنے لگا تو اس کا نام گاندھی جی نے سیواگرام رکھ دیا وہاں کوئی باقاعدہ آشرم نہیں تھا اور نہ ٹالسٹائی فارم کی طرح رہن سہن کے لائق اس کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ کہنا چاہیے کہ وہ گاؤں سدھار کے متعلق گاندھی جی کے خیالات کا خاص مرکز تھا۔ یہ سابرمتی سے اس معنے میں مختلف تھا کہ کچھ دنوں بعد اس میں ایک خیال کے لوگ رہنے لگے جو آشرم کے نظریات پر ایمانداری سے عقیدہ رکھتے تھے۔

دیہی صنعت سنگھ نے گاؤں میں کام کرنے والوں کی تربیت کے لیے ایک تربیتی مرکز کھول دیا اسی طرح مویشی کی نسل میں سدھار، تعلیم میں تجربات اور غذا سے متعلق مسائل کے لیے دوسرے ادارے قائم کر دئے گئے یہ سب گاندھی جی کی نگرانی میں چلتے تھے۔

گاؤں سدھار کے کام میں گاندھی جی کی اس دلچسپی سے ان کے کچھ ساتھیوں نے ایسا خیال کیا کہ گاندھی جی خاص سیاسی مقصد یعنی برطانی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کو ٹال رہے ہیں۔ دوسری طرف حکومت نے یہ خیال کیا کہ گاندھی تحریک سول نافرمانی کے لیے عوام کی وسیع حمایت حاصل کرنے کے واسطے نیا راستہ نکال رہے ہیں کچھ

دوسرے لوگوں نے گاندھی جی پر یہ الزام لگایا کہ وہ چرخے اور ہتھ کرگھے پر زور دے کر صنعت میں سائنسی طرز پر ترقی کی اہمیت کو کم کر رہے ہیں گاندھی جی اب بھی مشینوں پر اعتراض کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مشین صرف چند لوگوں کو کام فراہم کرتی ہیں، دولت کو اِنے گنے آدمیوں کے ہاتھوں میں اکٹھا کرتی ہیں اور پہلے سے پھیلی ہوئی زبردست بے کاری میں اور اضافہ کرتی ہیں۔ جسمانی محنت کو گاندھی جی بڑی اہمیت دیتے تھے ایک بار انھوں نے وردھا سیواگرام روڈ پر روئی کی ایک پونی دیکھی جو دو انچ سے بھی کم لمبی ہوگی۔ انہوں نے اپنے ساتھ کی ایک لڑکی سے اسے اٹھا لینے کو کہا۔

لڑکی سمجھی کہ باپو کو سڑک پر کوڑا پڑا رہنا پسند نہیں ہے اس لیے اس نے پونی اٹھا کر کونے میں پڑے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ بعد میں جب باپو نے پوچھا کہ پونی کہاں ہے؟ تو وہ حیران رہ گئی۔

باپو نے اس لڑکی سے کہا "تم نہیں جانتیں کہ کپاس کے اگانے، اوٹنے اور پونی بنانے میں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ جس آدمی نے اسے پھینک دیا وہ یقیناً مجرم ہے اور جو تم اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکیں اس سے دوگنی مجرم ہو" تب وہ لڑکی گئی اور پونی اٹھا کر لے آئی۔

گاندھی جی نے اسے خود اپنے چرخے پر کاتا۔ اس واقعہ سے ان کے سب ساتھیوں کی نظر میں جسمانی محنت کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی۔

گاندھی جی پر نکتہ چینی اور دوسرے اسباب کی بنا پر بھی کی جانے لگی اور یہ نکتہ چینی ایسے لوگ کرتے تھے جو اگر چاہتے تو ان کے نظریات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔ گاندھی جی ایک ایسے سماج پر عقیدہ رکھتے تھے جس کی بنیاد معاشی لامرکزیت پر ہو اور جس کا نظام جمہوری ہو تاکہ عوام سچی آزادی محسوس کر سکیں۔ ہندوستان میں ۱۹۳۵ء میں جن نوجوانوں نے سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی تھی وہ گاندھی جی کے خاص نکتہ چینوں میں تھے جس کی بڑی وجہ یہ تھی گاندھی جی نہ تو طبقاتی تصادم کے قائل تھے اور نہ اسے لازمی خیال کرتے تھے۔ سرمایہ پرست بھی ان کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ گاندھی جی سماجی ناانصافی سے جنگ کرتے تھے اس کے بڑھاوے کی ذمہ داری سرمایہ داروں ہی پر ڈالتے تھے اور ان ہی کو مجرم قرار دیتے تھے۔

گاندھی جی مزدوروں کا پیٹ کاٹ خون پینے والی صنعت کاروں کے خلاف تھے۔ ان کی رائے میں، دولت اکٹھا کرنا سماجی برائی ہے ان کا خیال تھا کہ ہر قسم کی جائداد خدا کی ملکیت ہے اور آدمی کو اسے امانت کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہیے۔

گاندھی جی کے تصور کے سماج میں ہر شخص کو اپنے پاس اتنا رکھنا چاہیے جتنی اسے ضرورت ہو اسے اپنی طاقت اور اہلیت کے مطابق کام کرنا چاہیے اور اپنی ضرورت بھر کا لینا چاہیے۔ گاندھی جی کے خیال میں دولت مندوں کو چاہیے کہ وہ اپنی دولت غریبوں اور مصیبت زدوں کی مدد کے دے دیں اگر وہ سمجھانے سے خود ایسا نہ کریں تو ان کے ساتھ عدم تعاون کیا جائے لیکن اس عدم تعاون میں تشدّد نہیں ہونا چاہیے۔

اگرچہ گاندھی جی کا کافی وقت لکھنے پڑھنے اور ملنے کے لیے آنے والوں سے بات چیت میں صرف ہو جاتا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے گاؤں سیوا کا اپنا کام جاری رکھا۔ خطوط لکھنے میں ان کا بہت وقت نکل جاتا تھا۔ ان کے ساتھیوں سے معلوم ہوا کہ وہ کفایت اور آسانی کے خیال سے لکھنے کے لیے ہر قسم کے پرزے اور ٹکڑے استعمال کر لیا کرتے تھے — جیسے پرانے لفافے، اخباروں پر لپٹا جانے والا کاغذ وغیرہ۔ ہندوستان میں اس وقت کاغذ کم دستیاب تھا اور اب بھی اس کی کمی ہے یہی وجہ ہے کہ دکاندار سامان کاغذ میں لپیٹ کر دینے کے بجائے عام طور پر یونہی کھلا دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی ملکوں میں سامان پلاسٹک کے تھیلوں میں یا ڈبوں میں دیا جاتا ہے۔

سیوا گرام میں گاندھی جی کا پروگرام پہلے کے مقابلے میں زیادہ مشغول تھا وہ روزانہ صبح تین بجے اٹھ جاتے اور خطوط کے جواب لکھتے، ان کے پاس کافی خط آتے تھے سویرے چار بجے عبادتی جلسہ ہوتا جس میں ان کے سب ساتھی شریک ہوتے، آدھے گھنٹے بعد ٹہلنے جاتے اور پھر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے، اس کے بعد کھجور اور دہی کا ناشتہ کرتے، وہ ہمیشہ سے سبزی خور تھے وہ اپنے کھانے پر پندرہ روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہ کرتے۔ گیارہ بجے رات تک وہ اپنے دوسرے کاموں میں لگے رہتے۔ سوتے وہ کھلی جگہ میں تھے۔ اور مچھر دانی استعمال نہیں کرتے تھے۔

کیونکہ غریب آدمیوں کو مچھر دانی نصیب نہیں ہے لیکن منہ پر تیل چپڑ لیتے تھے وہ لیٹتے ہی سو جاتے تھے اور انہیں گہری نیند آتی تھی۔

سیوا گرام میں ان سے ملنے کے لیے بڑے سے بڑے لوگ آتے تھے لیکن ملنے کے لیے آنے والوں میں سب سے زیادہ تعداد گاؤں کے لوگوں کی ہوتی تھی ایک مرتبہ بڑے ہندوستانی افسروں کا ایک گروہ ملنے کے لیے آیا۔ جب وہ لوگ گاندھی جی کے پاس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ دومعیادی بخار کے مریضوں کے ماتھے پر بھیگا کپڑا رکھ رہے ہیں اور ان کا بدن پونچھ رہے ہیں۔

ان افسروں میں سے ایک نے پوچھا کیا یہ سب کام آپ کو خود کرنا پڑتا ہے اس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا "تو اور کون کرے گا؟ اگر آپ گاؤں میں جائیں تو دیکھیں گے کہ چھ سو میں سے تین سو بیمار ہیں۔ ان کو سکھانے کے لیے اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے سوا اور کون سا طریقہ ہے؟"

جب وہ جنوبی افریقہ میں تھے تو بہت سے کان مزدوروں کی انھوں نے اس وقت بڑی مدد کی جب وہ طاعون کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ انہوں نے ایک خالی مکان کو اسپتال کی شکل دے دی تھی۔ جس میں تنتیس سال کی گنجائش تھی وہ وہاں مریضوں کو کپڑے پہناتے، ان کا بستر جھاڑتے اور ان کے ساتھ رہ کر انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ تیمارداری کے کچھ کاموں میں تو وہ ماہر ہو گئے تھے — جیسے اینما دینا، مریضوں کا بدن پوچھنا، تیل ملنا، پٹیاں رکھنا وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑا بہت کام بھی کر لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی پیدائش کے موقعہ پر کستوربا کی مدد کی تھی۔

جب نیا آئین ۱۹۳۷ء میں عمل میں آیا تو ہندوستان نے تھوڑی بہت اندرونی آزادی رفتہ رفتہ حاصل کرنی شروع کی۔ دو سال پہلے برطانی حکومت نے یہ آئین نافذ کیا تھا ونسٹن چرچل نے اس وقت اس کی مخالفت کی تھی۔ وہ ہندوستان کو آزادی دیے جانے کا سخت مخالف تھا۔ اسی بنا پر اس نے شہرت حاصل کی۔ چرچل تو ہندوستانی لیڈروں سے کسی قسم کی بات چیت پسند نہ کرتا تھا۔

ہندوستان کے متعلق چرچل کا رویہ بالکل ویسے ہی تھا جیساکہ ناول نگار رڈیارڈ کپلنگ کا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان ہمیشہ برطانوی حکومت کی نوآبادی بنا رہے۔ اور اس کے سامراج کے استحکام میں مدد کرتا رہے۔ وہ ہندوستان کے بارے میں بہت کم جانتا تھا جس نے موہن داس گاندھی کے خیالات کو اپنایا تھا اور اپنے اعلا مقصد (آزادی) کے حصول کے لئے اہنسا کے اصول پر چل کر تحریک چلائی تھی۔

ہندوستانی لیڈروں کی رائے تھی کہ نئے آئین میں بہت سی افسوسناک خامیاں ہیں پنڈت جواہر لال کا کہنا تھا کہ اس سے ہندوستان کو اختیار ملے بغیر اس پر ذمہ داری عائد ہو جائے گی لیکن نئے آئین کے ذریعے جزوی طور پر ہی سہی مگر سلف گورنمنٹ تو دی ہی گئی تھی۔ چنانچہ گاندھی جی نے کانگرس سے سفارش کی کہ وہ صوبوں میں وزارت بنائے۔ اس کے بعد جب وائسرائے نے یہ بیان دے دیا کہ گورنر صوبائی حکومتوں کے کام میں دخل نہیں دیں گے تو کانگرس نے کچھ صوبوں میں وزارت کی تشکیل کا فیصلہ کیا۔

گاندھی جی نے کانگرس کے وزیروں کو صلاح دی کہ وہ سادگی سے رہیں۔ محنت کریں، غیر جانب دارانہ رویہ رکھیں اور اچھے کردار کا ثبوت دیں۔ گاندھی جی نے دو کاموں پر کافی زور دیا ۔ نشہ بندی اور تعلیم۔ انہوں نے ان دونوں کاموں کی طرف کانگرسی حکومتوں کو خاص طور پر توجہ دلائی۔ اکتوبر کے مہینے میں انہوں نے وردھا میں تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک قومی کانفرنس طلب کی اور اس میں تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات پیش کیے۔

انہوں نے اس کانفرنس کے سامنے کئی اہم باتیں رکھیں ۔ جیسے دیہی علاقوں میں دستکاری یا دیہی صنعتوں کو تعلیم کے ایک جز کی طرح شامل کیا جائے انگریزی کے بجائے ذریعہ تعلیم مادری زبان بنائی جائے۔ اس بنیادی تعلیم میں سات سال کے بچوں کو لیا جائے اور چودہ سال کی عمر ہونے تک انہیں وہیں تعلیم دی جائے۔ دیہی اسکولوں میں تیار کی جانے والی چیزوں کو بیچ دیا جایا کرے اور اس سے تعلیم کا کچھ خرچ نکالا جائے۔

تعلیم کے متعلق گاندھی جی کے ان خیالات سے کھلبلی مچ گئی اور ان پر بحث شروع ہو گئی بعض لوگوں نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ گاندھی جی دستکاری پر اس لیے زور دینا چاہتے تھے کہ اس وقت جو تنہا کتابی تعلیم جاری تھی وہ کم ہو اور طالب علم کا رابطہ عملی تعلیم کے ذریعے اپنے ماحول سے قائم ہو۔

صوبائی حکومت بنانا اور وزارت کی گدی حاصل کرنا ایک ایسی خواہش تھی جو عرصے سے لیڈروں کے دلوں میں رشک پارہی تھی۔ اس کے پورے ہونے سے جو کامیابی حاصل ہوئی وہ اپنے ساتھ آپس میں رشک حسد کا جذبہ بھی لائی جس نے گاندھی جی کو رنجیدہ اور فکرمند بنا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت میں رہنے سے کہیں زیادہ اہم گاؤں سدھار کا کام تھا۔ انہیں یہ دیکھ کر اور بھی پریشانی ہوئی کہ کانگرس وزیروں نے فرقہ وارانہ فسادات کو تشدد کے ذریعے روکنے کے لیے پولیس اور فوج کا استعمال ٹھیک اسی طرح کیا جیسے اس سے پہلے برطانی حکمرانوں نے کیا تھا گاندھی جی تو ہتھیاروں کے بجائے اس کا مقابلہ امن فوج کے ذریعے کرنا چاہتے تھے تقریباً تیس سال پہلے انھوں نے جو بات کہی تھی اسی کو اب پھر دہرا رہے تھے۔

ذرائع کی مثال بیج سے دی جاسکتی ہے اور مقصد کی پیڑ سے۔ ذریعہ اور مقصد میں وہی گہرا رشتہ ہے جو بیج اور پیڑ میں ہے۔ خدا کی خدمت سے حاصل ہونے والا مقصد مجھے شیطان کے سامنے چت لیٹ جانے سے نہیں مل سکتا اس لیے اگر کوئی کہے کہ — میں خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اور اگر یہ خدمت شیطانی ذرائع سے بھی کی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے — تو یہ بات بے وقوفی کی ہوگی جیسا ہم بوتے ہیں ویسا ہی کاٹتے ہیں۔"

۱۹۳۸ء میں گاندھی جی کی مخالفت کر کے نمایاں ہونے والوں میں محمد علی جناح تھے۔ جو بڑے وکیل اور سیاست دان تھے۔ وہ بہت سے معاملات میں گاندھی جی سے بالکل مختلف تھے وہ ہمیشہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ اور شاندار لباس پہنتے تھے۔ مذہبی خیالات سے انہیں کوئی دل چسپی نہیں تھی اور نہ انہیں کسانوں کی خراب حالت سے کوئی پریشانی تھی۔ انھوں نے گاندھی جی پر الزام لگایا کہ وہ ڈکٹیٹر

ہیں اور مسلمانوں کو نیست نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ گاندھی جی نے بہت سے ایسے کام کیے جن کا مقصد تھا کہ مسلم فرقے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

۱۹۳۹ء میں جناح نے متحد ہندوستان کے دو ٹکڑے کیے جانے کے نظریے کا پرزور پروپیگنڈہ کیا۔ ان کے اس خیال کی بنیاد مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی اختلاف پر تھی۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ پاکستان میں شمال مشرق اور شمال مغرب کے مسلم اکثریت والا علاقہ شامل کیا جانا چاہیے کیونکہ متحد ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں جہاں اُن کی آواز سنی نہیں جاتی۔ جناح کی تعلیم تقسیم ہند کی یہ تجویز مسلم لیگ نے اپنالی۔

اس تجویز سے گاندھی جی کو بڑا دکھ ہوا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ تجویز سنجیدگی سے پیش کی جارہی ہے۔ ان کا خیال تھا اور وہ اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے کہ مختلف مذہبوں سے مختلف قومیں اور تہذیبیں نہیں بن جاتیں۔ انھوں نے ساری زندگی ہندوستان کے لوگوں کو ملانے کی کوشش کی انھیں ڈر تھا کہ اس تجویز کی بنا پر تو ہندوستانی بہت خطرناک طریقے پر مٹ جائیں گے۔ اہنسا کے ان کے عقیدے کو اب ایک نئی آزمائش کا سامنا تھا۔ مسلمانوں کو زبردستی ملا کر نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

یورپ میں ۴۵-۱۹۳۹ء والی عالمی جنگ چھڑ جانے پر کانگریسی وزارتوں نے استعفا دے دیا جس سے مسلم لیگ کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ گاندھی جی کو نہ صرف فرقہ وارانہ کشمکش سے پریشانی تھی بلکہ دیسی ریاستوں کی صورت حال سے بھی وہ فکرمند تھے۔ اس وقت ان کی تعداد ۵۶۲ تھی یہ انگریزوں کی حمایت کر رہی تھیں اور ہر قسم کی سماجی تبدیلی کے خلاف تھیں۔

دیسی ریاستوں کی حالت سے وہ اچھی طرح واقف تھے کیونکہ ان کے والد اور دادا دونوں ہی دو چھوٹی ریاستوں — پوربندر اور راج کوٹ میں اونچے عہدے پر رہے تھے۔ ان ریاستوں کے راجے مہاراجے سماجی ترقی کی مخالفت تو کرتے ہی تھے اس سے بھی زیادہ رنج کی بات یہ تھی کہ قدیم یورپ کے جاگیردارانہ نظام کے گھسے پٹے اور پچھڑے رسم و رواج کو بدستور قائم رکھنا چاہتے تھے۔ صوبوں میں گاندھی جی نے جو

اصلاحات کی تھیں۔ ان کو انھوں نے دیسی ریاستوں میں نہیں شروع کیا تھا کیونکہ وہاں کے لوگوں کو ضروری تربیت دینا مشکل تھا۔ ریاستوں کی رعایا کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں تھی اور عدمِ تعاون کی کسی بھی تحریک میں وہاں قاعدے کی پابندی کرنا یقینی نہیں تھا۔ گاندھی جی کو یہ بھی امید تھی کہ اگر ایک جگہ کے لوگ کسی سمت میں آگے بڑھتے ہیں تو دوسری جگہ کے لوگوں کا اس طرف جھکاؤ ہونا لازمی ہے۔ اس وقت تک عوامی تحریک کافی آگے بڑھ چکی تھی، اس لیے کچھ دیسی ریاستوں میں بھی لوگوں نے اسی طرح کی مانگیں پیش کرنی شروع کر دی تھیں جو صوبوں کے لوگوں کو حاصل ہونے لگی تھیں۔ یعنی زیادہ آزادی اور کچھ زیادہ عوامی نمائندگی۔

بچپن میں گاندھی جی نے کئی برس راج کوٹ میں گذارے تھے۔ اس ریاست سے ان کا تعلق پرانا تھا۔ اس لیے وہاں کے لوگوں کی نمائندگی کی کمی کے مسئلے کو لے کر گاندھی جی نے عدمِ تشدّد کے طریقے پر ایک کوشش کی۔ وہاں کے رہنے والوں کی تعداد . . . ۵۷ تھی لیکن حکومت میں ان کی کوئی آواز نہیں تھی ۱۹۳۶ء کے آخر میں گاندھی جی کی وجہ سے وہاں کے حکمراں اور سردار پٹیل میں سمجھوتے کے ذریعے کچھ باتیں مانی گئیں۔ سیاسی قیدی چھوڑ دیے گئے اور سیاسی اصلاحات کا بھی وعدہ کیا گیا۔

مگر وہاں کے حکمراں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو گاندھی جی نے راج کوٹ میں برت شروع کر دیا۔ انھوں نے یہ برت اس وقت توڑا جب ان کے کہنے پر مرکزی حکومت کے ایک ذمہ دار درمیان میں پڑے اور راج کوٹ کی جنتا کے حق میں فیصلہ کیا۔ لیکن حکمراں اور اس کے دربار کے لوگوں نے کوئی تعاون نہیں کیا۔ تب گاندھی جی نے اعلان کیا کہ میں نے مرکزی حکومت کو درمیان میں ڈال کر غلطی کی۔ مجھے برت جلد ختم نہیں کر دینا چاہیے تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مرکزی حکومت کی مداخلت طلب کرنا اہنسا کے اصول کے مطابق نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے وائسرائے لارڈ لنلتھ گو اور ثالث سر مورس گائر سے جو ہندوستان کے چیف جسٹس تھے، ان سے معافی مانگی۔ اور کوٹ کے حکمراں سے لوگوں کی حالت سدھارنے کو کہا۔

معافی مانگنے پر لوگوں نے سخت نکتہ چینی کی لیکن گاندھی جی اپنے خیال کو صحیح

سمجھتے رہے اور کہا کہ ستیہ گرہ کا راستہ محبت کا راستہ ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ راج کوٹ کے لوگوں میں تربیت اور تنظیم کی سخت کمی ہے اس لیے انھوں نے ان سے کہا کہ آپ صرف اس چیز کی مانگ کیجیے جس کی آپ انصاف کے مطابق امید کر سکتے ہیں — یعنی بولنے، ملنے اور پریس کی آزادی، قانون کے سامنے مساوات اور آزاد انصاف۔

بے جوڑ باتیں کہنے اور کرنے کی شکایتوں کی گاندھی جی نے کبھی کوئی پروا نہیں کی کچھ غیر معتدل نکتہ چینیوں نے انہیں ''پراسرار پہیلی'' کہا کچھ نے ''بے جوڑ اصولوں کا ڈھیر'' قرار دیا۔ ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے گاندھی جی نے لکھا :-

'' میں مانتا ہوں کہ میری بہت سی باتیں بے میل ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ مجھے مہاتما کہتے ہیں تو میں ایمرسن کی یہ بات کیوں نہ دہرادوں کہ'' بے وقوفی سے ایک ہی طرح کی باتیں کرتے رہنا چھوٹے دماغ کی نشانی ہے' میرا اپنا خیال ہے کہ میری بے میل باتوں میں بھی ایک طرح کا ربط ہوتا ہے۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ'' جو دوست مجھے جانتے ہیں وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ میں جتنا معتدل ہوں اتنا ہی انتہا پسند اور جتنا انقلابی ہوں اتنا ہی قدامت پرست شاید یہی وجہ ہے کہ میری خوش قسمتی سے انتہا پسند لوگوں میں بھی میرے دوست رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ امتزاج اہنسا کے میرے نظریے کا نتیجہ ہے۔

'' رسم و رواج اور روایت کا میں کبھی غلام نہیں رہا۔ میں نے کبھی کوئی سیاسی رعایت حاصل کرنے کے لیے اخلاقی اصول کی قربانی نہیں دی۔ ایک سی بات سے چپکے رہنے کی عادت کا میں غلام نہیں ہوں''

مگر تشدد کو ذریعے کے طور پر استعمال کی مخالفت وہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں لیکن فوری حالات کے مطابق رویہ اختیار کرنے میں، وہ اعتدال پسند رہے ہیں۔

ایک مرتبہ گاندھی جی سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ملک (یا حکومت) پوری طرح عدم تشدد کا پابند ہو جائے تو کیا ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا ''پوری طرح عدم تشدد کا پابند نہیں ہو پائے گا کیونکہ وہ سب لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے ..... ایسے

سماج کے امکان پر عقیدہ رکھتا ہوں جو زیادہ سے زیادہ عدم تشدد کا پابند ہو....
ایسے سماج کی نمائندگی کرنے والی حکومت کم سے کم طاقت کا استعمال کرے گی....
کوئی بھی حکومت اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ انتشار کا بول بالا ہو.... اس
لیے اہنسا کی پابند حکومت میں بھی تھوڑی سی پولیس کی ضرورت رہے گی۔

کراچی کے جلسے میں گاندھی جی کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے غنڈوں کی ایک
گروہ نے ان پر حملہ کردیا اور کوشش کی کہ ان کو دبوچ لیں اور زخمی کردیں اسی
دن پانچ لاکھ کے عام جلسے میں گاندھی جی نے اس واقعہ کا ذکر کیا اور ہنس کر کہا۔

"اپنی حفاظت کے لیے مجھے کوئی باڈی گارڈ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے اگرچہ میرا
سینہ کھلا ہوا سامنے رہتا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے کوئی مار نہیں سکتا کیونکہ میرا باڈی
گارڈ قادر مطلق خدا ہے"

اس سے ان کا یہ مطلب کبھی نہیں تھا کہ وہ انسان سے بلند کوئی چیز ہیں بلکہ ان
کا کہنا صرف یہ تھا کہ ان کے جسم کو ختم کر دینے سے ان کے خیالات اور نظریات سے چھٹکارا
نہیں مل سکتا۔

20۔ نئی جنگ۔ نئی گرفتاریاں

عالمی جنگ چھڑنے تک، اہنسا پر گاندھی جی کا عقیدہ اور زیادہ پختہ ہو گیا
تھا وہ سوچتے تھے کہ کمزور ملکوں کو حملہ آوروں کا مقابلہ اہنسا کے ذریعے کرنا چاہیے۔
اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں سے یہ امید کی جائے کہ وہ مخالف کے ساتھ کوئی
تعاون نہ کریں گے اور اگر ضرورت ہوگی تو مرنے کو تیار ہو جائیں گے لیکن خود کسی کی جان
نہ لیں گے۔ ہر آدمی مارنے کے بجائے مرنے پر آمادہ رہے گا۔ ان کا خیال تھا کہ ہٹلر اور
مسولینی جیسے ڈکٹیٹروں کو بھی متاثر کیا جا سکتا ہے۔ ان کا پختہ خیال تھا کہ ہر شخص پیار
اور محبت سے پگھل سکتا ہے۔

انہوں نے کہا تھا کہ کسی دنیاوی طاقت کے آگے چاہے وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ
ہو گردن جھکانے سے صاف انکار کر دینا سب سے بڑی بہادری ہے اور یہ انکار کسی

قسم کا نفرت کا جذبہ دل میں لیے بغیر کرنا چاہیے اور اس گہری عقیدت کے ساتھ کہ صرف روح غیر فانی ہے کوئی دوسری چیز نہیں۔"

موہن داس گاندھی کے لیے اہنسا (عدم تشدد) جنگ میں لڑنے کے لیے نئے طریقے کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ ان کی زندگی کا ایک اصول بن گیا تھا۔

جب برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ کا اعلان ہوا تو ہندوستان بھی مجبوراً اس میں شامل ہوگیا حالانکہ انگریزی حکومت نے ہندوستانی وزیروں یا سیاسی لیڈروں سے اس سلسلے میں کوئی صلاح ومشورہ نہیں کیا تھا مگر بہر حال کانگرس کی ہمدردی اسی کے ساتھ تھی۔

وائسرائے لارڈ لنلتھ گو نے گاندھی جی کو شملہ میں بلایا۔ اس زمانے میں گرمی کے موسم میں سرکاری اعلا افسر میدانی علاقے کی گرمی سے بچنے کے لیے شملہ جیسے پہاڑی علاقہ میں چلے جاتے تھے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا کہ میری اخلاقی حمایت آپ کے ساتھ ہے کیونکہ میں انگلستان اور فرانس کا ہمدرد ہوں لیکن اخلاقی حمایت کے سوا اور میں کچھ نہیں کرسکتا اس بار ان کا نقطہ نظر ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء والی جنگ سے مختلف تھا۔ جس میں انھوں نے ریڈ کراس کے ذریعے مدد کی تھی۔

انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میرا خیال اپنی جگہ پر اٹل ہے یعنی ہندوستان کو مخالف کا سامنا کرنے کے لیے اہنسا کے راستے کو اپنانا چاہیے لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھیوں میں سے بہت کم ان کے طریقہ کار کو پسند کریں گے۔

گاندھی جی کی یہ صلاح کتنی غیر عملی تھی اسے انھیں سمجھنا چاہیے تھا کیونکہ ہندوستان کے لوگوں نے ابھی تک اپنے تمام گھریلو مسائل کے حل کے لیے اہنسا کا سبق اچھی طرح نہیں سیکھا تھا۔ لیکن جہاں تک ان کے اصول کا تعلق ہے وہ اس بنا پر غلط نہیں ہوسکتا۔

جنگ شروع ہوئے ابھی دو ہفتے بھی نہیں بیتے تھے کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے تعاون دینے کی تجویز منظور کی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کے بدلے میں ہندوستان کی آزادی کی مانگ کی۔ حکومت نے کانگرس کا یہ مطالبہ نہیں مانا۔ ۱۹۴۰ء میں جب جرمنی فتح کے راستے پر آگے بڑھتا معلوم ہو رہا تھا اور ہندوستان پر بھی حملے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا تب کانگرس نے پھر تعاون کی پیش کش کی اور اس مرتبہ یہ مانگ کی

کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے۔

کانگرس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ جنگ کے لڑنے میں انگلستان کی مدد کرتے وقت گاندھی جی کے اصول کو اپنائے اس لیے درحقیقت اس نے اپنے پروگرام سے گاندھی جی کو الگ رکھا۔

لیکن ایسا کرنے پر بھی کانگرس کو وہ نہ ملا جس کی اسے امید تھی۔ آزادی کے تو محض وعدے کئے گئے اور بات چیت محدود اختیار دینے کی شروع کی گئی۔ ایک گشتی چھٹی میں جو حکومت کی جانب سے افسروں کو بھیجی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ اگر کانگرس "جنگ کا اعلان کرتی ہے" تو حکومت سخت کاروائی کرنے کو تیار ہے یہاں تک کہ حکومت گاندھی کو پھر گرفتار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے" لطف کی بات یہ تھی اس گشتی چھٹی پر وہی تاریخ لکھی تھی جس دن حکومت کی طرف سے کہا گیا تھا کہ آئینی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مگر اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی گئی جس سے کانگرس کو بڑی مایوسی ہوئی اور رام گڑھ کے جلسے میں اس نے حکومت کی مخالفت کا فیصلہ کیا۔ گاندھی جی کو اختیار دیا گیا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں تحریک چلائیں۔ چنانچہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کو گاندھی جی نے ایک مہم شروع کر دی۔ وہ مہم یہ تھی کہ ہندوستان میں اظہار خیال کی آزادی نہ ہونے کے خلاف مظاہرے کئے جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو یہ آزادی مل جائے کہ وہ جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے خلاف اظہار خیال کر سکیں۔ اس مہم میں 'شخصی ستیہ گرہ' تھا اور اسے ان چند ہی لوگوں تک محدود رکھا گیا جنھیں گاندھی جی اس لائق سمجھیں کہ وہ ضروری نظم و ضبط قائم رکھ سکیں گے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فساد یا تشدد کے واقعات نہ ہو سکیں۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اس پروگرام کی اطلاع وائسرائے کو دے دی تھی۔

ستیہ گرہ کا نعرہ یہ تھا:۔ جنگ میں آدمی یا پیسے سے انگریزوں کی مدد کرنا بالکل غلط ہے۔ سب سے ٹھیک بات یہ ہے کہ ہر جنگ کا مقابلہ اہنسا کے ذریعے کیا جائے"

خیال یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے یہ سول نافرمانی شخصی طور پر کی جائے عام طور پر نہ کی جائے۔ گاندھی جی نے پھر تعمیری کاموں پر زور دیا جس کے لیے وہ برسوں

سے کہتے چلے آرہے تھے ۔ تعمیری کام میں رفتہ رفتہ بہت سی چیزیں شامل ہوتی جارہی تھیں جیسے مزدور تنظیم، سوت کی کتائی، کھادی کی بنائی، دیہی صنعت، تعلیم بالغاں عورتوں کی حالت کا سدھار، ہندوستانی زبان کا پرچار، ہندو مسلم اتحاد اور نشہ بندی۔

کچھ ہی دنوں بعد اس نئی سول نافرمانی میں شرکت کرنے والے گاندھی جی کے حمایتی گرفتار کیے جانے لگے۔ گاندھی جی نے سب سے پہلا ستیہ گرہی ونوبا بھاوے کو چنا اور ایک عام جلسے میں تقریر کرنے پر وہ گرفتار کر لیے گئے۔ آگے چل کر گاندھی جی کے انتقال کے بعد ونوبا جی گاندھیائی اصولوں کے خاص ماننے والے سمجھے جاتے رہے۔ دوسرے ستیہ گرہی جواہر لال نہرو تھے جنہیں کئی مہینے پہلے کی تقریروں پر چار سال کی سزا دی گئی۔ سات ہفتوں کے اندر قریب کانگرس کے چار سو اراکینِ مجالس قانون ساز جیل بھیج دیئے گئے۔ ان میں سے ۲۹ تو صوبائی حکومتوں کے سابق وزیر تھے۔

۱۹۴۱ء کے خاتمے تک پچیس[۲۵] ہزار سے زائد شخصی ستیہ گرہ کرنے والوں کو سزا دی جا چکی تھی لیکن ابھی تک عام تحریک نہیں شروع ہوئی تھی کیونکہ تحریک کو شخصی سطح پر رکھنے کے منصوبے پر گاندھی جی نے سختی سے عمل کیا تھا۔ اس تحریک نے برطانیہ کی جنگی کاروائیوں میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی اور نہ اس تحریک کا یہ مقصد ہی تھا گرفتار کیے جانے والوں کو ہلکی سزائیں دی گئیں۔ گاندھی جی کے کچھ نکتہ چینوں کی یہ سمجھ میں آیا ہی نہیں کہ اس طرح ستیہ گرہیوں کے جیل جانے سے کچھ کام نکلے گا کہ نہیں۔

دسمبر ۱۹۴۱ء کے شروع میں حکومت نے ان ستیہ گرہیوں کو چھوڑ دیا جو تحریک سول نافرمانی میں پکڑے گئے تھے۔ ۷ دسمبر کو پرل ہاربر پر جاپان کا حملہ ہوا اور پھر امریکہ بھی عالمی جنگ میں شامل ہو گیا۔ جاپان کی وجہ سے ہندوستان کو بھی خطرہ پیدا ہو رہا تھا۔ اکثر ہندوستانی دانشور نازیوں، ڈکٹیٹروں اور جاپانیوں کے مخالف تھے لیکن گاؤں میں رہنے والے عوام کو پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

کانگرس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں برطانی شہنشاہیت، فسطائی آمریت

(ڈکٹیٹر شپ) ہی کی طرح ہے اس نے علامتی سول نافرمانی کا پروگرام جاری رکھا کیونکہ اس کی رائے تھی کہ انگریز ہندوستان کی آزادی کی مانگ کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ گاندھی جی کی خواہش تھی کہ جنگ کی مخالفت اہنسا کے ذریعہ ہونا چاہیے۔

دونوں گروہوں کو ایک سوال پریشان کر رہا تھا کہ اگر جاپان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تو اس کا مقابلہ تشدد سے کیا جائے گا یا عدم تشدد سے؟ گاندھی جی یہ مانتے تھے کہ اکثر کانگریسی لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ بدیسی دشمن کا مقابلہ اہنسا کے ذریعے کس طرح کیا جائے گا؟۔

اسی درمیان برطانی حکومت نے ہندوستان کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک مشن مقرر کیا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس کچھ تجاویز کے کر گفت و شنید کے لیے ہندوستان آئے وہ تجویزیں یہ تھیں — صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات جنگ کے بعد ہوں۔ ایوانِ زیریں کے ممبران ایک آئین ساز کمیٹی منتخب کریں جو آئین بنائے وغیرہ۔ ان کا مقصد تھا کہ ہندوستان کو مکمل نوآبادیاتی آزادی ملے اور مذہبی اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت ہو لیکن دیسی ریاستوں کے ساتھ حکومت برطانیہ الگ سمجھوتے کرے گی۔

گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ تجاویز منظور کرنے کے لائق نہیں معلوم ہوئیں کیونکہ دیسی ریاستوں سے الگ سمجھوتے کی بات وہ غلط سمجھتے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اس طرح حکومت ایک متحدہ قوم بننے کے بجائے چھوٹی چھوٹی وحدتوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ اس قسم کی پالیسی سے محمد علی جناح کی حوصلہ افزائی ہو گی کہ وہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو ہندوستان سے الگ کر لیں۔

ان اختلافات کو دور کرنے کی کوشش ناکام رہی اس لیے وہ تجاویز نہیں اپنائیں گئیں، جنگ کے دوران برطانیہ ہندوستان کو سلف گورنمنٹ دینے کو تیار نہیں تھا۔ کرپس نے سمجھوتے میں ناکامی کا ذمہ دار گاندھی جی کو ٹھہرایا۔ انہیں شکایت تھی کہ گاندھی نے ان تجاویز کی کانگرس ورکنگ کمیٹی کی جانب سے منظوری میں مداخلت کی اور ساری اسکیم الٹ دی۔

مورخوں کی بعد کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ کرپس نے گاندھی جی کو تار بھیجا

تھا کہ دہلی آکر مل لیں گاندھی جی کو ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ دہلی گئے لیکن بات چیت کے پہلے ہی دور میں وہ دہلی سے واپس آئے۔ ان تجاویز کے بارے میں آخری فیصلہ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے کیا۔ جسے یہ علم تھا کہ گاندھی جی ان تجاویز سے مطمئن نہیں اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کسی معاملے میں مداخلت کرنے کی گاندھی جی کی عادت نہیں۔ بہرحال لکھنے والے جو چاہے لکھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کرپس مشن کی ناکامی سے گاندھی جی کو بڑی مایوسی ہوئی۔

اسی درمیان انگریزوں اور ان کے دوست ملکوں کے خیال میں جنگ کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ ہندوستان پر جاپان کے حملے شروع ہوگئے تھے اس لیے گاندھی جی اور ان کے نقطۂ نظر کو ماننے والوں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے لیڈروں نے طویل مدتی پروگرام ملتوی کر دینے کا فیصلہ کیا اور سارا دھیان حملے اور حملے کے مقابلے کے معاملے کی طرف لگا دیا۔ لیکن حکومت کے ذریعے فوج میں بھرتی، تیاری اور رسد جمع کرنے کے کام زیادہ زور شور سے ہو رہے تھے جس سے ہندوستانی عوام کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ انگریزی حکومت نہ تو نیک نیت ہے اور نہ ہماری آزادی کی مانگ کو کوئی اہمیت دیتی ہے۔

اس موقع پر گاندھی جی نے حیرت میں ڈالنے والی ایک تجویز رکھی وہ یہ کہ برطانیہ فوراً ہی ہندوستان کو آزادی دے دے۔ انھوں نے کہا صرف اسی طریقے پر انگلستان کو جنگ میں ہندوستان کی حفاظت کے لیے ہندوستانی عوام کی حمایت ٹھیک طور سے مل سکتی ہے۔ اس تجویز کی بنیاد پر ہی وہ نعرہ بنا جو آگے چل کر 'ہندوستان چھوڑ دو' کے نام سے بہت مشہور ہو گیا۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی اس تجویز کو منظور نہیں کیا گیا۔ اور انھیں 'شکست خوردہ ذہنیت والا' کہا جانے لگا۔ کچھ نے تو انہیں غدّار کا نام دیا حفاظت کا سامان کیسا ہی کیوں نہ ہو مگر حملہ ایک حقیقت کی شکل میں اب بھی سامنے تھا۔

جاپانیوں کے حملے یا ان کے بڑھاؤ کے اندیشے کے پیش نظر گاندھی جی نے میرابہن کو اڑیسہ جانے کو کہا تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو عدم تشدد کے ذریعے مقابلے کی تعلیم

دیں وہ وہاں گئیں اور کام کرنے لگیں بعد میں ایک خط میں گاندھی جی نے میرا بہن کو لکھا کہ وہ لوگوں کو ایسی تعلیم دیں، کہ اگر جاپانی حملہ کریں تو ان کے ساتھ پوری طرح عدم تعاون کیا جائے۔ لوگوں کا فرض ہوگا کہ وہ حملہ آوروں کے سامنے مرضی سے سر نہ جھکائیں جہاں حملہ ہوا ہو وہ علاقہ چھوڑ دیں۔ اور آخری سانس تک مقابلہ کرتے رہیں۔

اسی درمیان گاندھی جی نے ایک اور تجویز رکھی جو ان کے بنیادی اصول کے خلاف معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ دوست ملکوں کی فوجیں ہندوستان میں رہیں کیونکہ جاپان کے خلاف عدم تشدد کے ذریعے کامیاب مقابلہ یقینی، نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دو اور باتوں کے لیے انھوں نے رضامندی ظاہر کی۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہو اور دوسری یہ کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے بہت زیادہ خواہاں تھے۔

گاندھی جی نے اپنے خیالات میں تبدیلی کیوں کی۔ یقیناً یہ تبدیلی دو وجہوں سے کی گئی ایک تو یہ کہ جنگ نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی تھی دوسری یہ کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے بہت زیادہ خواہاں تھے۔

ان کی اس تجویز کا بھی وہی حشر ہوا جو پچھلی تجویزوں کا ہو چکا تھا یعنی یہ بھی نہیں مانی گئی۔ اس لیے ۸ / اگست ۱۹۴۲ء کو کل ہند کانگرس کمیٹی نے 'ہندوستان چھوڑو' تجویز منظور کر لی اور ساتھ ہی ساتھ یہ آگاہی دی کہ گاندھی جی کی قیادت میں تحریک سول نافرمانی شروع کی جا سکتی ہے۔ دوسرے دن سویرے تڑکے ہی گاندھی نہرو، پٹیل، آزاد اور دوسرے لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں برطانی حکومت کے خلاف تشدد فوراً ہی شروع ہو گیا۔ عمارتیں جلا دی گئیں، ریلوے لائنیں اکھاڑ دی گئیں، ٹیلی فون کے تار کاٹ دئے گئے۔ حالانکہ گاندھی جی کی صلاح تھی کہ تحریک اہنسا کے اصولوں کی بنیاد پر چلائی جائے ظاہر ہے کہ ان کاموں کے جواب میں بھی سخت کارروائی شروع ہو گئی۔

گاندھی جی کو پونا کے پاس آغا خاں محل میں نظر بند کیا گیا۔ یہ محل بردوا سے زیادہ دور نہیں، تھا جہاں انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گذارا تھا۔ آغا خاں محل میں

وہ اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۴ء تک رہے۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی جس میں اونچی اونچی محرابیں، مینارے اور سائبان تھے ایک بڑا چوڑا لان تھا جس میں تاڑ کے پیڑ اور فوارے لگے تھے لیکن بہر حال تھا وہ ایک جیل خانہ۔

گاندھی جی نے وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا ذمہ دار تشدد والے واقعات کو ٹھہرایا۔ لیکن ونسٹن چرچل کی رائے تھی کہ یہ تو مسلح بغاوت کی تیاری تھی، جو ایک لمبے عرصے سے کی جا رہی تھی لیکن ان کے اس خیال کی تردید اس بات سے ہوتی ہے کہ گاندھی جی نے تو سول نافرمانی کا منصوبہ تیار کیا تھا جو ان کی گرفتاری کی وجہ سے آگے نہیں بڑھایا جا سکا۔ اس منصوبے کے مطابق وہ سب کانگریسی استعفا دینے والے تھے جو سرکاری کونسلوں یا اسمبلیوں کے ممبر تھے۔ اس کے علاوہ اس منصوبے میں اور بھی چیزیں تھیں جیسے، نمک قانون توڑنا، لگان ادا نہ کرنا اور سولہ برس سے زائد عمر کے لڑکوں کا اسکول، کالج چھوڑ دینا۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ اس تحریک سے ان لوگوں کو الگ رکھا جائے گا جن پر فرقہ واریت کا اثر ہو یا جن کے دل میں کسی ہندوستانی یا انگریز کے خلاف نفرت یا کینہ ہو۔

اس مسئلے پر آغا خاں محل سے گاندھی جی اور وائسرائے کے درمیان کافی خط و کتابت ہوئی۔ ۱۰ فروری ۱۹۴۳ء کو گاندھی جی نے ۲۱ دن کا برت شروع کر دیا اور وہ خطرناک حد تک کمزور ہو گئے لیکن حکومت کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ بدستور مایوس کن رہا۔ بہت سے سیاسی گروہوں نے گاندھی جی کی رہائی کی اپیل کی لیکن حکومت پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ وائسرائے نے برت کو 'سیاسی فریب' قرار دیا جس سے عوام اور زیادہ بیزار ہو گئے۔

گاندھی جی اب اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ انہیں اب لمبے عرصے تک جیل میں رہنا پڑے گا۔ انہوں نے جیل کی زندگی کا ایک پروگرام بنا لیا تھا جس پر وہ بڑی مستقل مزاجی سے عمل کرتے تھے۔ وہ اپنے روز کے کھانے میں کلوری کی تعداد نوٹ کرتے رہتے تھے تاکہ صرف اتنی کلوری اندر جا سکے جتنی صحت برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سے زائد نہ جا سکے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت، ٹہلنے اور پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ پچھلی مرتبہ انھوں نے جیل میں جس طرح انوکھی کتابوں کو پڑھا تھا اسی طرح

اس مرتبہ بھی کتابوں کی فہرست انوکھی تھی۔ مصنفوں کے نام یہ تھے :۔ شیکسپیر، براؤننگ، شا، مارکس، انجیلز، لینن اور اسٹالن۔ انھوں نے اپنی اسی نظر بندی کے دوران سرمایہ کے متعلق مارکس کی مشہور کتاب "کیپٹیل" (حصہ اول) پہلی بار پڑھی اس وقت ان کی عمر ۷۴ سال کی تھی، مارکس کی کتاب کے متعلق ان کی رائے یہ تھی۔

"میں اس سے زیادہ اچھی طرح لکھ سکتا ہوں اگر مجھے اتنا وقت ملتا جتنا مارکس کو مطالعے کے لیے ملا۔ مجھے اس کی کوئی فکر نہیں کہ مارکسزم صحیح ہے یا غلط ہے، تو صرف یہی جانتا ہوں کہ غریب لوگ دبائے اور ستائے جا رہے ہیں ان کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جانا چاہیے مجھے تو یہی بات ٹھیک لگتی ہے "

'آغاخاں محل' نظر بندی کے دوران انہیں دو زبردست ذاتی صدمے پہنچے جو جیل کی زندگی سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھے۔

21 - آزادی اور تقسیم

گاندھی جی کو اپنے بہت سے ساتھیوں میں سب سے زیادہ پیارے مہادیو ڈیسائی تھے وہ ۱۹۱۷ء میں ان کے ساتھ آ گئے تھے جب سے وہ گاندھی جی کے ساتھ بڑی محنت سے برابر کام کرتے رہے باپو برابر جیل جاتے رہتے تھے اور بڑی لگن کے ساتھ دقتیں، ان کی راہ میں پیدا کرتی رہتی تھی لیکن، ان سب کے باوجود مہادیو دیسائی ہمیشہ ان کے ساتھیوں کے ساتھ رہتے تھے اور بڑی لگن کے ساتھ ان کی خدمت کرتے تھے 'آغاخاں محل' جیل میں پہونچنے کے چھٹے دن ہی ۱۵ راگست ۱۹۴۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ کام کا بوجھ تو ہمیشہ ان پر رہتا ہی تھا اس کے علاوہ انہیں کچھ اور فکریں بھی پریشان رکھتی تھیں جیسے 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کا مستقبل، باپو کی صحت اور یہ ڈر کہ کہیں وہ کوئی بڑا برت نہ رکھ لیں۔ انہیں فکروں سے وہ اتنی جلد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف پچاس برس کی تھی وہ اچانک چند منٹوں میں ختم ہو گئے ان کے مرنے کے متعلق کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسی جیل میں بغل کے کمرے میں میرابہن رہتی تھیں انہوں نے لکھا ہے :۔
"مہادیو بھائی کے اس طرح اچانک انتقال سے سب لوگ حیران رہ گئے، غم سے سب کے دل ڈوبے جارہے تھے ایک تو یہ صدمہ کہ ایسا نیک اور اپنے فرائض پوری طرح اداکرنے والا شخص ہم سے جدا ہوگیا دوسرے یہ فکر کہ ان کے انتقال سے گاندھی جی کو جو دھکا لگا ہے اس کی تلافی نہ ہو پائے گی۔
مہادیو دیسائی کی موت کا ردِ عمل کستوربا پر اس طرح ہوا :۔ باپو کا داہنا ہاتھ اور بایاں، دونوں ہاتھ کٹ گئے۔"
مہادیو دیسائی کے آخری رسوم محل کے باہر لیکن اس کے احاطے کے اندر ادا کی گئیں۔
وہاں ایک سمادھی بنادی گئی۔ باپو روزانہ صبح کے وقت بڑی پابندی سے وہاں جاتے اور پھول چڑھاتے اور ان کے ساتھی بھگود گیتا کے شلوک اور بھجن گاتے۔
میرابہن نے سمادھی پر مٹی کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنادیا اور اس پر ادم چاند تارا اور کراس بنادیا میرابہن نے لکھا ہے" کراس اس قربانی کی نشانی تھا جو مہادیو بھائی کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔"
گاندھی جی کے لیے یہ بڑا زبردست صدمہ تھا لیکن اس کے بعد اور صدمے کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔ کستوربا جو پہلے سے بیمار تھیں وہ آغا خاں جیل ہی میں ۲۲ فروری ۱۹۴۴ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔
کستوربا پہلے سے کہہ گئی تھیں کہ میرے مرنے پر آخری رسوم کے وقت۔ مجھے وہ ساڑی پہنادی جائے جو باپو کے ہاتھ کے کاتے سوت سے بنی گئی ہو۔ اس وصیت سے اس خلوص و محبت کا پتہ چلتا ہے جو ان دونوں میں تھا۔ ان دونوں نے شادی شدہ زندگی کے باسٹھ سال ایک ساتھ بسر کئے تھے کستوربا گاندھی جی کی ساری جدو جہد میں ان کے ساتھ رہیں اور جیل کی تکلیفیں بھی جھیلیں۔
ان کے انتقال کے بعد گاندھی جی نے کہا " میرے دماغ میں، سوائے با کے کسی اور چیز کا خیال آتا ہی نہیں " جس تخت پر با بیٹھتی، اور لیٹتی تھیں اسے دیکھ کر وہ کہتے تھے " یہ تخت میرے لیے بہت قیمتی ہوگیا ہے اس پر با کے لیٹے رہنے کی تصویر

میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت گھوما کرتی ہے" با کے آخری لمحوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا " آخری وقت با کا مجھے بلانا اور میری گود میں لیٹے لیٹے آخری سانس لینا نہ بھولنے والی بات ہے" میاں بیوی میں ایسا گہرا تعلق کم دیکھنے کو ملتا ہے

آخری رسوم آغاخاں محل کے احاطے ہی میں ادا کی گئیں۔ کستور با اور مہادیو بھائی کی سمادھیاں پاس ہی پاس ہیں ان دو صدموں کا اثر گاندھی جی کی صحت پر پڑنا لازمی تھا وہ کمزور تو تھے ہی انہیں ملیریا بھی ہوگیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں جیل ہی میں ان کا بھی انتقال نہ ہو جائے حکومت نے انہیں رہا کر دیا اور وہ ۶ مئی ۱۹۴۴ء کو باہر آ گئے۔

ان کے جیل چھوڑنے سے کچھ گھنٹے پہلے اس نظربندی کیمپ کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر کیٹیلی ان سے ملنے آئے۔ انہوں نے کہا " کل جب آپ باہر جائیں گے تو بادشاہ کے ایک ملازم کی حیثیت سے میں وردی پہنے ڈیوٹی پر کھڑا ہونگا اس لیے میں پہلے ہی سے آپ کی دعائیں لینے آگیا ہوں۔

عبادت کے بعد جب گاندھی جانے لگے تو مسٹر کیٹیلی نے ان کی اگلی ۷۵ ویں سالگرہ کے لیے ۷۵ روپئے کی تھیلی پیش کی اور کہا " مہاتما جی جیل کے باہر تو آپ کو بہت سی تھیلیاں ملیں گی لیکن پہلا نمبر کیٹیلی کی اس تھیلی ہی کو دیا جائے"

گاندھی جی کے ساتھی انھیں جو ہو لے گئے جو بمبئی کے پاس سمندر کے قریب اچھی صحت بخش جگہ ہے۔ ان کے مرض کی تفصیل کے ساتھ جانچ کی گئی تب پتہ چلا کہ ان کو پیچش کی شکایت ہے۔ معدے میں کیڑے پیدا ہو گئے ہیں اور خون کی بہت کمی ہے کئی ہفتوں کے علاج کے بعد وہ اچھے ہو سکے۔

اس عرصے میں ہندوستان پر جاپانی حملے کا اندیشہ تو کچھ کم ہوگیا لیکن ملک بھر میں قحط پھیلا ہوا تھا۔ کانگرس کو حکومت نے غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ گاندھی جی نے کانگرس اور حکومت میں میل کرانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے وائسرائے اور مسٹر چرچل کو خط لکھے اور ایسی میٹھی زبان میں لکھے جو ایک ستیہ گرہی کو زیب دیتی ہے اپنے خطوط میں انہوں نے ہندوستان کے لیے قومی حکومت کی تجویز رکھی۔ مسٹر چرچل اور وائسرائے دونوں گاندھی جی سے خوش نہیں تھے چرچل تو گاندھی جی

سے نفرت کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے گاندھی جی کی اہانت کی تھی اور انہیں "ننگا فقیر" کہا تھا۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی نے انہیں یہ خط لکھا:۔

پیارے وزیر اعظم

کہا جاتا ہے کہ آپ کی خواہش ہے کہ 'ننگے فقیر' کو کچل دیا جائے۔ بہت دنوں سے میں فقیر بننے کی کوشش کر رہا ہوں پھر ننگا فقیر۔ جو کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ اس لیے آپ کی جانب سے اس لقب کو اپنی عزت افزائی خیال کرتا ہوں حالانکہ اس لقب سے آپ کا مقصد عزت افزائی نہیں تھا مگر بہر حال میں اس خط کے ذریعے آپ کے پاس اسی روپ میں آرہا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھ پر بھروسہ کریں اور اپنے ملک اور میرے ملک کے مفاد میں اور ان کے ذریعے دنیا کے مفاد میں مجھے استعمال کریں۔

آپ کا مخلص دوست

ایم۔ کے۔ گاندھی

مگر یہ خط وزیر اعظم برطانیہ مسٹر چرچل کے پاس نہیں پہنچا۔ دو مہینے بعد اس کی نقل پھر بھیجی گئی جس کی رسید بعد میں آئی۔

گاندھی جی نے مسٹر جناح کو بھی خط لکھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ سے سمجھوتہ ہو جائے۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا تب انھوں نے مسٹر جناح سے ملنے کے لیے وقت مانگا۔ ستمبر میں دو ہفتے سے زائد دونوں میں بات چیت ہوتی رہی لیکن اس بات چیت کا اور بعد کی ملاقاتوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ مسٹر جناح اسی بات پر اصرار کرتے رہے کہ مسلمانوں کا الگ ملک ہونا چاہیے۔ ان ملاقاتوں سے مسٹر جناح کی اہمیت کافی بڑھ گئی اور ان کی ضد بڑھتی گئی جس سے گاندھی جی کو بہت دکھ ہوا کیونکہ وہ بٹوارہ کبھی نہیں چاہتے تھے۔

یورپ میں جنگ مئی ۱۹۴۵ء میں ختم ہوگئی۔ اگست میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں الکشن کرائے اور آئین بنانے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کرنے کا وعدہ کیا اب برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہو چکی تھی، 'وزیر ہند' کے عہدے

پر ایک نیا آدمی آگیا تھا۔ سلف گورنمنٹ پر بات چیت کے لیے ایک پارلیمانی وفد ہندوستان بھیجا جانے والا تھا لیکن کانگرس کے لیڈروں کو اب بھی برطانی حکومت پر کوئی بھروسہ نہیں تھا۔

۱۹۴۶ء کے شروع میں جب لام بندی ختم کی جانے لگی تو ہندوستان کے لوگوں کی امید مایوسی میں تبدیل ہونے لگی اور برطانی حکومت کے خلاف جذبہ ابھر آیا اور وہ بغاوت پر آمادہ ہوگئے اور اب تشدد اور عدم تشدد کا کوئی لحاظ نہیں رہ گیا تھا۔ تب برطانیہ کی لیبر پارٹی، ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے زیادہ فکرمند ہوگئی۔ برطانیہ کے نئے وزیراعظم میکمنٹ ایٹلی نے اس سلسلہ میں نئی پالیسی اختیار کی۔ اس نئی پالیسی کے پیچھے وہ جذبہ تھا جسے پیدا کرنے کے لیے برسوں تک موریل لسٹر، چارلس اینڈ روز، ہورس الگزنڈر، فیز براکوے اور ہولڈ لاسکی جیسے اصول پرستوں نے پرخلوص کوشش کی تھی۔

ایٹلی نے اپنی کابینہ کے تین ممبروں کو جن میں سر اسٹیفورڈ کرپس بھی شامل تھے۔ ایک مشن پر ہندوستان بھیجا یہ لوگ بہت سے لوگوں سے ملے اور اس درمیان گاندھی جی سے بھی بات چیت کرتے رہے۔ بات چیت کا خاص موضوع تقسیم تھا۔ یعنی اس کی ضرورت ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو اس کی شکل کیا ہوگی۔ آئینی ڈھانچے کے لیے ایک تفصیلی منصوبہ بنایا گیا۔ مجموعی طور پر آئینی نظام سے گاندھی جی متفق تھے لیکن مسودے کے متعلق انہیں کچھ شکوک تھے۔

ان کو فکر یہ تھی کہ کانگرس کہیں جلد بازی میں منصوبے کو منظور نہ کرلے انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد کہیں ملک میں تشدد نہ شروع ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بات چیت ہورہی تھی تو ملک میں ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے جن میں بدمعاشوں کا بھی ہاتھ تھا اس لیے گاندھی جی نے عدم تشدد اور رواداری کی اپیل کی۔ انھوں نے خواب میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ کیا ہونے جارہا ہے۔

برطانی حکومت نے پنڈت جواہر لال نہرو سے حکومت بنانے کو کہا۔ انھوں نے اس حکومت میں شامل ہونے کی درخواست مسٹر جناح سے کی۔ انہوں نے شرکت سے انکار کردیا اور کانگرس پارٹی کو برا بھلا کہا۔ مسٹر جناح نے ۱۶ راگست ۱۹۴۶ء کو دو

اقدام دن' منانے کا اعلان کیا۔ اس موقعے پر کلکتہ میں چار روز تک فساد رہا جس میں پانچ ہزار سے زائد لوگ مارے گئے اور اس سے تین گنے زخمی ہوئے۔ بنگال کی صوبائی حکومت اقلیتی فرقے کے ہاتھ میں تھی اس لیے ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں نے تشدد کا سہارا لیا جس سے صورت حال کافی بگڑ گئی اس کے ردِعمل میں اور زیادہ خون خرابہ ہوا۔

مشرقی بنگال میں صورت حال خاص طور پر خراب تھی اس لیے گاندھی جی نے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ جسے انھوں نے 'زبردست پاگل پن' کہا تھا وہاں انھیں اس کے نتائج صاف نظر آئے۔ ان کے دورے کا مقصد اس علاقے کے لوگوں کی مدد کرنا تھا۔ شروع میں تو صوبائی حکومت نے ان سے تعاون کیا۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ ملک کے اس حصے میں نفرت اور عدم اعتماد کی فضا پیدا ہوگئی تھی اور وہاں اہنسا (عدم تشدد) کے کوئی معنے نہ رہ گئے تھے۔

انھوں نے شری رامپور گاؤں جانے کا فیصلہ کیا جہاں پہلے ہندو اور مسلمان دونوں رہتے تھے لیکن اب وہاں ہندو قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو آس پاس کے گاؤں میں بھیجا اور اپنا خاص مرکز شری رامپور میں رکھا ان دنوں ان کے پاس فرنیچر کے طور پر صرف لکڑی کا ایک تخت تھا جو دن میں ڈسک کا اور رات میں پلنگ کا کام دیتا تھا۔

وہاں گاندھی جی مقامی مسلمانوں سے جا کر ملتے تھے رفتہ رفتہ وہ لوگ ان کا مشن سمجھنے لگے۔ یہ وہ مذہبی گروہ تھا جو پہلے انہیں برا بھلا کہتا تھا۔ گاندھی جی کا مقصد تھا کہ ہندو، مسلمان پھر مل جائیں گے۔ مسلم اخبارات کی مخالفت کے باوجود وہ فرقہ وارانہ تناؤ کم کرنے میں کامیاب ہوتے لیکن آخر میں اخباروں نے صوبائی حکومت اور کچھ مسلمان لیڈروں کو بھڑکا دیا جس سے انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ گاندھی جی اس علاقے سے چلے جائیں کیونکہ ان کے رہنے سے طرح طرح کے سیاسی نتیجے نکل سکتے ہیں۔

وہ ننگے پاؤں آس پاس کے گاؤں گئے اور مارچ میں وہ بہار چلے گئے جہاں ہندوؤں نے مسلمانوں سے بدلا لیا تھا۔ وہاں انہوں نے لوگوں سے رواداری اور

میل ملاپ کا برتاؤ کرنے کی اپیل کی فساد کے مارے ہوئے مسلمانوں کی مدد کے لیے ہندوستان نے پیسے اکٹھا کیے۔

اسی درمیان یہ محسوس ہوا کہ برطانوی کابینی مشن کی تجویز کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ مسلم لیگ کو عارضی حکومت میں شرکت کی جو دعوت دی گئی تھی وہ اس نے قبول نہیں کی۔

۱۹۴۷ء کے شروع میں برطانی وزیراعظم اٹیلی نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ انگریز جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو آزاد کر دینا چاہتے تھے اور کل ہند آئین بنانے کی تجویز کو حکومت برطانیہ منظوری دے دے گی۔ اس اعلان سے پوری دنیا میں سنسنی پھیل گئی کیونکہ اس کی امید کسی کو نہ تھی کہ اتنی جلد ہندوستان کو آزاد کر کے اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔

ہندو لیڈر تو اس اعلان سے مطمئن تھے لیکن مسلم لیڈروں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو اقتدار نہ سونپنے کی ایک ترکیب ہے۔ جب صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں تو مسلم اکثریت والے علاقوں میں مسلم وزیر وزارت میں آئے اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادنئی شکل میں پھوٹ پڑے۔

ان دنوں گاندھی جی کوشش کر رہے تھے کہ ملک کے مختلف حصوں سے فرقہ واریت کا زہر دور ہو اور ہندو مسلمانوں میں میل ملاپ پیدا ہو جائے۔ وہ خود اپنی مثال پیش کر کے اختلاف دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کام میں گاندھی جی کی پوتی منو بہن ان کی مدد کر رہی تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جاڑوں کے موسم میں باپو ایک گاؤں گئے جہاں ایک چھوٹی بچی بیمار تھی اسے معیادی بخار بھی تھا اور نمونیا بھی جب باپو اس بچی کے پاس گئے تو گھر کی عورتیں ہٹ گئیں کیونکہ وہ پردہ کرتی تھیں وہ ایک غریب مسلمان کی لڑکی تھی، دبلی، پتلی بے جان سی۔ گاندھی جی نے اپنی شال اسے اوڑھا دی۔ اس کا منہ دھویا اور اسے آرام سے لٹا دیا اس کے بعد انھوں نے منو بہن سے کہا کہ بچی کو شہد اور گرم پانی دو اور سر پر مٹی کی پٹی رکھو رات ہوتے ہوتے بچی کا بخار غائب ہو گیا۔

اس بچی کی رشتہ دار عورتیں جو گاندھی جی کے آنے پر ہٹ گئی تھیں آ گئیں

انھوں نے بہت احسان مندی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ " اس کے بدلے میں ہم آپ کو کیا دے سکتے ہیں، آپ ہماری نظر میں خدا کے پیغمبر ہیں" باپو نے جواب دیا :۔

نہیں کوئی فرشتہ ہوں نہ پیغمبر میری زندگی کا مقصد دوسروں کی خدمت کرنا ہے اور آپ کی خدمت ہی کے لیے میں یہاں آیا ہوں .... اس بچی کے اچھے ہونے کی نیک نامی میں لینا نہیں چاہتا اس میں میری بزرگی کا کوئی سوال نہیں اسے صاف ستھرے طریقے پر رکھا گیا۔ شال اوڑھادی گئی اور شہد استعمال کرایا گیا۔ اس کی صحت ٹھیک ہو گئی۔ میں، آپ سے صرف، اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ " نہ آپ کسی سے ڈریں اور نہ کسی کو ڈرائیں ... "

گاندھی جی کو ملک میں فسادات کی بنا پر مایوسی ہونے لگی انہیں یہ خیال ستانے لگا کہ اہنسا کے علمبردار کی حیثیت سے میں ناکام ہو رہا ہوں وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں انھوں نے اپنے مشن کی کامیابی کے متعلق بہت زیادہ امیدیں باندھ رکھی تھیں دوسری طرف ہندو مسلم تنازعہ نے غیر معمولی صورت حال پیدا کردی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کے صبر کا جام لبریز ہوگیا تھا اور انھیں حکومت پر بھی بھروسہ نہیں رہ گیا تھا لوگ آپس میں مل کر جگہ جگہ فوجی قسم کے گروہ بنانے لگے تھے گاندھی جی ان خطروں کو محسوس کر رہے تھے لیکن ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ جب اہنسا، بھائی چارے اور رواداری کے اصولوں کے متعلق پچھلے بیس، پچیس برسوں میں لوگوں کو اتنا سمجھایا گیا تو پھر وہ ایسے تشدد اور بے رحمی پر کیسے اتر آئے۔

گاندھی جی کا ہندوؤں پر کافی اثر تھا لیکن مسلمانوں پر بہت کم تھا ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس کوئی اونچے پائے کا ایسا لیڈر تھا ہی نہیں جو گاندھی جی کے اصولوں اور پروگراموں کو مانتا ہو۔ مسلمان کے ممتاز لیڈر مسٹر جناح تھے لیکن اہنسا کے نظریے سے انہیں نہ تو کوئی دلچسپی تھی نہ کوئی واقفیت۔ ہندو اور مسلمان دونوں لیڈر اپنے آدمیوں کو روکنے میں تقریباً ناکام ثابت ہو رہے تھے۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنایا گیا۔ اس سے حکومت برطانیہ کو یہ امید تھی کہ ہندوستان میں خانہ جنگی نہ ہوگی۔ انھوں نے آنے کے بعد جلد

ہی گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ دہلی آکر ان سے ملیں۔ انہوں نے آنے سے بیٹن کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ مسٹر جناح سے کہیں کہ وہ حکومت بنائیں تاکہ کانگرس اور ہندوؤں کے بارے میں ان کے شبہات دُور ہوں۔

لیکن برطانی حکومت اور دوسرے ہندو لیڈروں کو یہ تجویز عجیب و غریب معلوم ہوئی۔ مسٹر جناح بھی وائسرائے سے ملے اور ان کے سامنے تقسیم کی اپنی تجویز رکھی تب کانگرس نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ حیرت زدہ رہ گئی اور گاندھی جی کو بڑا دکھ ہوا وہ فیصلہ تھا تقسیم کو مان لینا۔

کانگرس میں کچھ ایسے لیڈر تھے جو تقسیم کے خلاف تھے گاندھی جی تو کبھی ایسا نہیں چاہتے تھے لیکن اکثریت نے جو فیصلہ کیا اس کے پیچھے یہ خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی جو بھی حکومت بنے گی وہ ہمیشہ انتشار کا شکار رہے گی اس لیے اس مستقل انتشار کے مقابلے میں تقسیم بہتر ہے چنانچہ تقسیم کے سلسلے میں بات چیت شروع ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ اس بات چیت میں گاندھی جی بالکل شریک نہیں رہے ان کا خیال تھا کہ تقسیم تو تباہی ہے لیکن کانگرس کے بڑے لیڈروں اور مسلم لیگ نے تقسیم منظور کر لی تھی اس لیے انھوں نے دخل نہیں دیا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ کانگرس میں پھوٹ پڑ جائے۔ ان کا خیال تھا کہ کانگرس کو اتحاد کی اس وقت پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن جس چیز کی وہ حمایت کر رہے تھے ان کا دل اس کے ساتھ نہیں تھا ان کے دلی احساس کا علم ان سے بہت قریب رکھنے والے کانگریسی لیڈروں کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔

اب انھیں یہ فکر ہوئی کہ اقتدار کی منتقلی اس ڈھنگ سے ہو کہ اس سے برآمد ہونے والے نتیجے ملک کے لیے نقصان دہ نہ ہوں۔ انھوں نے اپنا سارا دھیان اسی طرف لگا دیا۔ فساد والے علاقوں کا دورہ تو وہ کر ہی چکے تھے وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی بنا پر انھیں ڈر لگ رہا تھا کہ اقتدار کی منتقلی یعنی آزادی ملنے کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے جب دو حکومتیں قایم ہو جائیں گی تو بڑے پیمانے پر فساد ہوں گے جو خطرناک ثابت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

فساد روکنے کے لیے گاندھی جی کے اثرات کو کام میں لایا گیا ہندوؤں کے معاملے میں تو وہ کامیاب رہے جو فوراً ان کا اثر قبول کر لیتے تھے اس طرح انتشار جلد ہی ختم ہو گیا۔ ۱۴ راگست کو یوم آزادی سے پہلے والی شام کو کلکتہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے آزادی کی تقریب پر امن طریقے پر منائی۔ شام کے وقت روزانہ گاندھی جی کا عبادتی جلسہ ہوتا تھا جس میں دونوں مذہبوں کے ہزاروں لاکھوں آدمی شریک ہوتے تھے۔

لیکن آزادی ملنے کے کچھ ہی دنوں بعد مغربی پاکستان اور ہندوستان میں فساد شروع ہو گئے تھے کلکتے میں بھی پھر سے تشدد کی آگ بھڑک اٹھی کلکتے میں ہندوؤں کے ایک مجمع نے کاریگروں کے ایک مکان پر حملہ کر دیا جس میں گاندھی جی ٹھہرے ہوئے تھے کئی بار وہ اینٹوں اور لاٹھیوں کی چوٹ سے بچے۔

کلکتے میں پہلی ستمبر کو انہوں نے برت کا اعلان کیا۔ برت کا مقصد یہ تھا کہ لوگ مل جل کر رہیں دونوں فرقوں کے لیڈروں نے فوراً امن کا عہد کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے شمال مشرقی حصے میں امن قائم ہو گیا۔

وہاں سے گاندھی جی پنجاب یعنی مغربی ہندوستان اور پاکستان کی طرف چلے جہاں بلوے ابھی تک ہو رہے تھے جب پچاس لاکھ ہندو اپنے گھر چھوڑ کر ان علاقوں میں جائیں گے جہاں مسلمان رہتے تھے اور اسی طرح لگ بھگ اتنے ہی مسلمان ہندو علاقوں میں بسنے جائیں گے تو مسائل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ جہاں وہ بستے وہاں تشدد کسی نہ کسی شکل میں زور پکڑ لیتا لیکن گاندھی جی پنجاب یا مغربی پاکستان کبھی پہونچ نہ سکے کیونکہ دہلی بھی بدامنی کا مرکز بن گیا تھا۔ مغرب کی طرف جانے کے ارادے سے گاندھی جی دہلی آئے لیکن یہاں کی حالت دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال یہیں رکنا چاہئیے۔ کیونکہ اس شہر کو بھی ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ وہ برلا ہاؤس میں ٹھہرے۔ کلکتے کی طرح یہاں بھی ہزاروں لاکھوں لوگ ان کے عبادتی جلسے میں درشن کے لیے آتے تھے وہ تقریر کرتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ بدلا لینا غلط ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں اہنسا پر عقیدہ رکھنا چاہیے اور لڑنا جھگڑنا نہیں چاہئیے گاندھی جی پناہ گزیں کیمپوں میں بھی جاتے تھے اور پناہ گزینوں کے آرام کا بندوبست کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن تشدد کا سلسلہ چلتا ہی رہا۔

انھوں نے سوچا کہ کلکتے کی طرح ممکن ہے یہاں بھی برت رکھنے سے بدامنی دور ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۸ء سے برت رکھنے کا فیصلہ کیا۔

22۔ قربانی

گاندھی جی نے اعلان کیا کہ برت اسی وقت توڑا جائے گا جب شہر میں پھر سے امن قایم ہو جائے گا۔ پانچ دن کے اندر مختلف پارٹیوں کے لیڈروں نے امن قایم رکھنے کے ایک عہدنامے پر دستخط کیے۔ جھگڑے بند ہو گئے۔ گاندھی جی پاکستان جانا چاہتے تھے تاکہ وہاں کے پناہ گزینوں کی مدد کر سکیں یہ ارادہ دہلی آنے سے پہلے ان کا تھا۔ گاؤں سیوا کے کام کی طرف وہ پھر توجہ کرنا چاہتے تھے۔

لیکن ۲۰ر جنوری کو جب گاندھی جی برلا ہاؤس کے اندر عبادتی جلسے میں تقریر کر رہے تھے تو ایک بم پھٹا انھوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی حالانکہ وہ بم جہاں وہ بیٹھے تھے اس سے چند ہی فٹ کی دوری پر گرا تھا۔ انھوں نے پولیس سے کہا کہ جو نوجوان بم پھینکنے کا ذمہ دار ہے اسے کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اس کا نام تھا مدن لال جو پنجاب سے آیا پناہ گزیں تھا۔ مدن لال ہٹ دھرمی ہندوؤں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا ان لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے مذہب کو مسلمانوں سے اور گاندھی سے خطرہ ہے۔

اسی گروہ کا دوسرا ممبر ناتھورام ونائک گوڈسے بھی تھا وہ پونا کا ایک صحافی تھا۔ وہی پونا جہاں کی جیل میں گاندھی جی برسوں رہے تھے۔

بم گرنے کے بعد سے پولیس کو فکر ہوگئی وہ چاہتی تھی کہ عبادتی جلسے میں آنے والے ہر شخص کی تلاشی لی جائے لیکن گاندھی جی کو یہ بات منظور نہیں تھی پولیس کو شبہہ تھا کہ ہو سکتا ہے کہ گاندھی جی کے قتل کی سازش کی جا رہی ہو۔ یہ نفرت اور دشمنی ایک ایسے آدمی سے کیوں تھی جس کی زندگی کا اکثر حصہ اپنے ہم وطنوں کی خدمت میں گذرا تھا اور جس کے خاص اصول کی بنیاد انسانی بھائی چارے اور محبت پر تھی۔ انتہا پسند ہندو جن کی نمائندگی مدن لال اور ناتھورام گوڈسے کرتے تھے پاکستان سے

جنگ چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گاندھی جی اسے روکنا چاہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ روکنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندوستان اس لڑائی میں جیت جائے گا اور پاکستان، پھر ہندوستان میں مل جائے گا۔ وہ ایک اکھنڈ بھارت (غیر منقسم ہندوستان) کا خواب دیکھ رہے تھے ان کو شکایت تھی کہ گاندھی ہندوستان میں مسلمانوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ جبکہ پاکستان میں ہندوؤں کو قتل کیا جا رہا ہے اور وہاں سے بھاگنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔

اس واقعے کے دس دن بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی شام کو عبادتی جلسے میں آنے کے لیے اپنے کمرے سے نکلے۔ یہ ان کا روزانہ کا پروگرام تھا فرق صرف یہ تھا کہ اس دن انھیں چند منٹ کی دیر ہو گئی تھی، ان کے ساتھ ان کی پوتیاں آبھا اور منو تھیں دیر ہو جانے کی وجہ سے باپو تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے۔

جب جلسے میں پہنچے تو بڑا مجمع اکٹھا تھا۔ انھوں نے آنے میں دیر ہو جانے کی معافی مانگی اور نمسکار کیا اسی وقت گوڈسے آگے بڑھا اور ایک چھوٹے سے ریوالور سے قریب سے گاندھی جی پر تین گولیاں چلائیں۔

"رام، رام" کہتے ہوئے گاندھی جی وہیں پر گر پڑے پانچ منٹ کے اندر ان کا دم نکل گیا۔ انھوں نے اپنے آشرم میں بھی دوائیں بند کر دی تھیں اور ان کا استعمال خود ان کے لیے بھی نہیں ہوتا تھا اس لیے حادثے کے وقت کوئی دوا موجود نہیں تھی۔

خبر پاتے ہی نہرو، پٹیل، پرشاد، دیوداس (گاندھی جی کے بیٹے) اور دوسرے لوگ فوراً آ گئے۔ سب سکتے کے عالم میں تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ آخری رسوم ادا کرنے کی تیاری ہونے لگی۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ ان کی لاش کو ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھا جائے لیکن مرنے کے بعد اپنے جسم کو پرستش کی چیز بنانے کی گاندھی جی نے ہمیشہ مخالفت کی تھی۔ اس لیے یہ خیال جلد ہی ترک کر دیا گیا۔ دوسرے دن شام کو جمنا کے کنارے آخری رسوم ادا کر دیے گئے جیسے جیسے آگ کے شعلے بجھنے لگے اسی طرح فرقہ واریت کی آگ بھی ٹھنڈی ہوتی گئی۔

ان کے قاتل نے غلط اندازہ لگایا تھا کہ ان کے مار ڈالنے سے وہ نہ ہو سکا جو وہ چاہتا تھا۔ گوڈسے پر مقدمہ چلایا گیا اور اسے پھانسی کی سزا دے دی گئی — جس کی

گاندھی جی کبھی منظوری نہ دیتے۔

گاندھی جی کے قریبی ساتھیوں کو سخت صدمہ ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انہوں نے پیارے باپ کو کھو دیا ہو۔ نہرو، سروجنی نائیڈو، سردار پٹیل اور کانگرس کے اور دوسرے لیڈر ہر مسئلے پر گاندھی جی سے متفق نہیں ہو پاتے تھے اور ان کی رائے سے اختلاف بھی کرتے تھے لیکن ان سب کو ان کی نیک دلی اور سچائی کے بارے میں ذرا بھی شک نہیں تھا۔

ان کے گہرے رنج کا اظہار نہرو کی اس درد بھری تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے گاندھی جی کی اچانک، دردناک موت کے موقعے پر ۳۰ رجنوری کی رات کو ریڈیو پر قوم کو خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ دنیا بھر کے لیڈروں نے گاندھی جی کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ لیکن نہرو کے ان الفاظ کا اپنا انوکھا انداز ہے:-

"ہماری زندگی کی روشنی ختم ہوگئی ہے اور ہر جگہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے میں نہیں جانتا کہ میں آپ سے کیا کہوں اور کس طرح کہوں ہمارے پیارے لیڈر جنہیں ہم باپو کہا کرتے تھے، اب نہیں رہے، شاید میں یہ غلط کہہ رہا ہوں۔ مگر ہم دوبارہ انہیں اس طرح نہیں دیکھ سکیں گے جس طرح گذشتہ بہت برسوں سے دیکھتے چلے آرہے تھے اب ہم ان کے پاس مشورے کے لیے نہ جائیں گے اور ان سے سکون حاصل نہ کر پائیں گے یہ ایک زبردست دھچکا ہے نہ صرف میرے لیے بلکہ ملک کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے لیے ....

میں نے ابھی کہا تھا کہ روشنی ختم ہوگئی ہے لیکن ایسی بات نہیں۔ میں نے غلط کہا تھا کیونکہ جو روشنی اس ملک میں پھیلی وہ معمولی روشنی نہیں تھی جس نور نے ملک کو عرصے تک روشنی دی ہے وہ آئندہ بھی برسوں تک اسے روشن رکھے گا اور ایک ہزار سال بعد بھی وہ روشنی اس ملک میں دکھائی دے گی اور اسے دنیا دیکھے گی اور بے شمار دلوں کو اس سے سکون حاصل ہوگا کیونکہ وہ روشنی ایسی چیز کی نمائندگی کرتی تھی جو زمانہ حال سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ وہ نمائندگی کرتی تھی غیر فانی، دوامی سچائیوں کی وہ صحیح راہ دکھاتی ہوئی غلطیوں سے بچاتی ہوئی اس قدیم ملک کو آزادی کی منزل تک لے گئی۔"
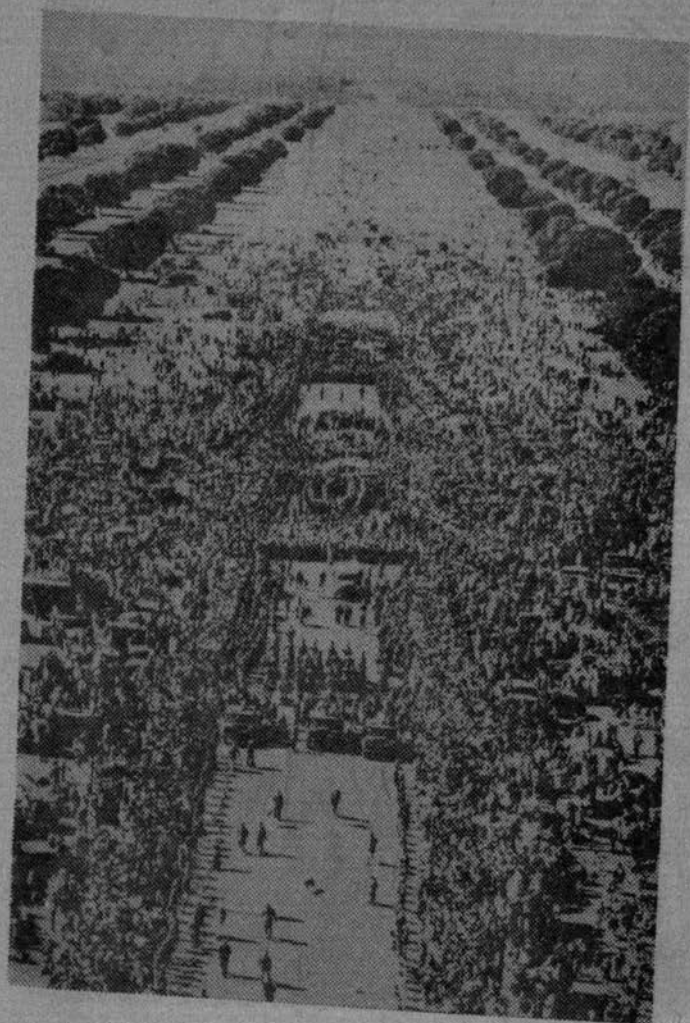
آخری سفر
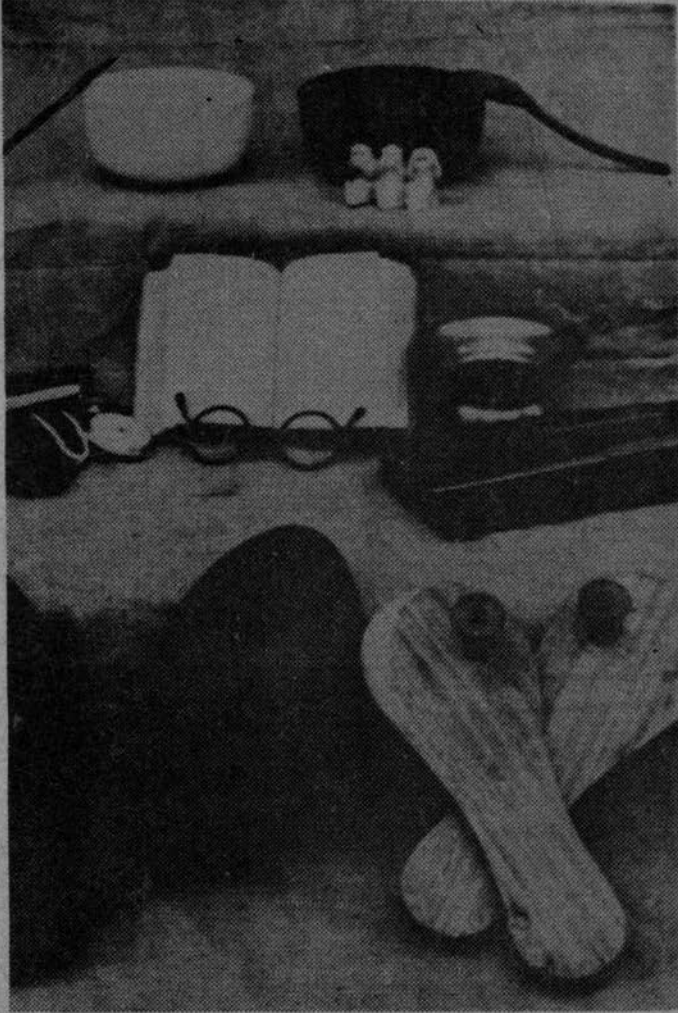
نشانیاں

23۔روح غیر فانی ہے

نہرو نے کہا تھا کہ ایک ہزار سال بعد بھی موہن داس گاندھی کی زندگی کی روشنی دنیا میں دکھائی دے گی یہ روشنی ہندوستان کے مقابلے میں دنیا کے دوسرے حصوں میں زیادہ دیکھی جانے والی تھی۔

جب برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ ۱۹۶۱ء میں ہندوستان آئیں، تو ان کا پہلا پروگرام دہلی پہنچ کر راج گھاٹ، پر گاندھی جی کی سمادھی دیکھنے جانا تھا وہاں انہوں نے ساڑھے چار سو سفید گلاب کے پھولوں کا ہار اس جگہ چڑھایا جہاں مہاتما گاندھی کی استھیاں رکھی ہوئی ہیں۔ بغل کے لان میں انہوں نے چار فٹ لمبا چیڑ کا ایک پودا بھی لگایا۔ اس موقعے پر ان کو اس نمونے کا ایک چرخہ پیش کیا گیا جو مہاتما گاندھی نے برووا جیل میں ایجاد کیا تھا۔ اس کے علاوہ ہاتھ کا کتا سوت اور باپو کی لکھی اور باپو کے متعلق لکھی ہوئی بہت سی کتابیں بھی دی گئیں۔

اس صورت حال اور کچھ سال پہلے گاندھی جی کے متعلق چرچل کے رویے میں زمین آسماں کا فرق ہے۔ محبت اور عدم تشدد کا جو نظریہ گاندھی جی نے پیش کیا تھا وہ ان کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا بلکہ مختلف طریقوں سے دنیا میں بدستور باقی ہے جہاں کہیں دبے اور کچلے ہوئے لوگ اہنسا کے ذریعے اپنے شہری حقوق مانگنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں گاندھی جی کے اہنسا کے طریقے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہمیشہ تو نہیں لیکن اکثر ہم نے اس طریقے کو کامیاب ہوتے دیکھا اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ طریقہ بار بار آزمانے کے لائق ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی کے طریقے سے اختلاف رکھنے والے ہندوستان میں بھی موجود ہیں اور دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی آپ ان لوگوں کو یہ کہتے سنیں گے کہ گاندھی جی کا اہنسا کا اصول ایٹمی دور کے مطابق نہیں ہے یا یہ کہ گاندھی جی سنت اور صوفی تھے اور ہم گناہ گار لوگ ہیں ہم ان کی نقل نہیں کر سکتے اور ان کے اصولوں پر پوری طرح عمل کر سکتے ہیں لیکن ان باتوں کے باوجود

گاندھی جی کی روح ہندوستانیوں کو مختلف طریقوں سے متاثر کرتی رہتی ہے۔

مثال کے طور پر ہم ونوبا بھاوے کو جانتے ہیں جن کو لوگ آچاریہ کہتے ہیں اور کچھ اچھے لکھنے والوں نے انہیں سب سے بڑا گاندھی وادی کہا ہے۔ ونوبا جی گاندھی جی کے شاگرد ہیں اور انھوں نے ۱۹۴۰ء میں انہی کو پہلا ستیہ گرہی نامزد کیا تھا۔ ونوبا بھاوے گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلتے رہے ۱۹۵۱ء سے اب تک انھوں نے چالیس لاکھ ایکڑ سے زائد زمین بے زمینوں کے لیے حاصل کی ہے اس ’متحرک مسیحا‘ نے جیسا کہ انہیں کہا گیا ہے۔ گاؤں گاؤں پیدل جاکر لوگوں سے اپیل کی اور کافی زمین حاصل کی انھوں نے اس کام کے سلسلے میں ۴۵،۰۰۰ میل کا چکر لگایا۔ سماج سدھار کے لیے انھوں نے جو مختلف کام کیے ان میں سے یہ ایک تھا۔ اس کے علاوہ کھیتی کے طریقوں میں بہتری، اندرونی آزادی، قحط زدوں کی امداد، تعلیم، کتائی بنائی، دیہی صنعت وغیرہ کے سلسلے میں بھی انہوں نے بہت کام کیا ہے۔

ایک بار ونوبا بھاوے نے ان جنگلوں اور بیہڑوں کا دورہ کیا جہاں ڈاکو رہتے تھے۔ چنبل گھاٹی کے علاقے میں وہ بارہ دن تک چلے سخت گرمی اور لو میں وہ گاؤں گاؤں گئے گاندھی جی کی طرح انھوں نے عبادتی جلسے بھی کیے اور ڈاکوؤں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال کر میل محبت کا راستہ اختیار کریں۔ انہوں نے آگاہی بھی دی کہ انہیں معافی کی امید نہیں رکھنی چاہیے اور قانون کا فیصلہ خوشی سے ماننا چاہیے ونوبا جی کی اس اپیل پر بیس ڈاکوؤں نے اپنے کو سپرد کر دیا ان میں سے کچھ پر بڑے بڑے انعام تھے۔

ونوبا بھاوے دبلے پتلے سچے اور بے لوث آدمی ہیں وہ چشمہ لگائے رہتے ہیں، بہت سی باتوں میں وہ گاندھی جی سے کافی ملتے جلتے ہیں انہوں نے اپنی پوری توجہ محبت کی طاقت آزمانے میں صرف کی ہے وہ عقیدت اور محبت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے :-

”مجھے انسان کے دل پر پورا بھروسہ ہے“

گاندھی جی کے انتقال کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں ستیہ گرہ کی جو مہیں،

تھیں ایک بہار میں مان بھوم ضلع والی دوسری گجرات (جو اس وقت بمبئی ریاست میں شامل تھا) کے ضلع سورت میں چلائی جانے والی۔ سورت کے یارڈی تعلقے میں ایک سیاسی گروہ نے چراگاہ کی زمین کھیتی کے لیے واپس لینے کے لیے ستیہ گرہ کا استعمال کامیابی سے کیا تھا۔ گاندھی جی کے انتقال کے بعد برت بھی رکھے جاتے رہے ہیں اگرچہ وہ ہمیشہ ان اونچے اصولوں کے لیے نہیں رکھے گئے جن کے لیے گاندھی جی رکھا کرتے تھے۔

بہت سے ادارے گاندھی جی کے کام کو آگے بڑھانے اور اس کے متعلق معلومات اکٹھا کرنے میں خلوص کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو خاص طور پر ہریجن لڑکے لڑکیوں کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں اور کچھ دوسرے مختلف کاموں میں لگے ہیں جیسے کتائی بنائی، کاغذ، صابن کی تیاری اور گئو سیوا۔

مختلف نسلوں اور قوموں کے درمیان اندرونی زبردست کشمکش کے باوجود افریقہ میں کبھی کبھی گاندھی جی کی تعلیم کی روشنی تیزی سے چمک اٹھتی ہے ان کی موت کے بیس۲ سال بعد بھی وہاں ان کے ماننے والے موجود ہیں۔ سب سے واضح مثال رابرٹ مینگلیز سوبکوے کی ہے جو جنوبی افریقہ میں پان افریقی کانگرس کے بڑے لیڈر رہیں وہ پرامن مقابلے پر عقیدہ رکھتے ہیں انھوں نے سیاہ فاموں اور ملے جلے خون والوں کے لیے اجازت نامہ رکھنے کی پابندی کے خلاف تحریک کی رہنمائی کی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ تحریک اس لیے چلائی گئی ہے کہ ان کے خیال میں افریقیوں کے حقوق کے حصول کی طرف یہ پہلا اور مشکل قدم ہے۔ انھیں اس سلسلے میں اپنے ملک کے بڑے سیاسی گروہ سے کوئی مدد نہیں ملی۔ اس نے تو الٹے ان کی تحریک سول نافرمانی اور جیل جانے کی تجویز کی مخالفت کی سوبکوے کے علاوہ دوسرے ہیں کنتھ کاونڈا جو افریقی ملک زمبیا کے صدر ہیں وہ برسوں سے اہنسا کا پرچار اور اس کی حمایت کرتے چلے آئے ہیں وہ سادگی سے زندگی بسر کرتے ہیں، سبزی خور ہیں اور گاندھی اور لنکن کا اپنے مرشد کی حیثیت سے احترام کرتے ہیں۔

البرٹ جان لتھلی پر تو گاندھی جی کا گہرا اثر تھا۔ وہ افریقہ کے بڑے لیڈروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ جنوبی افریقہ کی افریقی نیشنل کانگرس کے صدر بھی بنائے

گئے تھے انھیں ۱۹۶۰ء میں امن نوبل پرائز ملا تھا۔

الجیریا میں جو افریقہ کے شمالی سرے پر ہے اور جس سے فرانس کا قریبی تعلق ہے کچھ فرانسیسیوں نے الجیریا کی جنگ اور الجیریا کے لوگوں کو نظر بندی کیمپ میں رکھنے کی مخالفت کی اور ۱۹۶۰ء میں شہریوں کی عدم تشدد والی تحریک میں حصہ لیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک صحافی نے لکھا ہے :-

" عدم تشدد والی اس تحریک کے پیچھے انھی اصولوں اور طور طریقوں کی جھلک نظر آتی ہے جو گاندھی جی نے ہندوستان میں اختیار کیے تھے .... اسی کو بعد میں امریکہ کے سیاہ فاموں نے اپنایا اور حال ہی میں یہی طریقہ افریقی قوم پرستوں نے استعمال کیا۔

افریقہ کے مشہور بلجین کانگو کی راجدھانی لیوپولڈ بل میں ۱۹۶۰ء کے شروع میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی اس آگ پر قابو پانے میں بھی گاندھیائی طریقوں کی کامیابی کا ثبوت ملا ہے۔ اس کے متعلق ایک امریکی بشپ نے لکھا ہے :-

افریقی لوگ سول نافرمانی کر رہے ہیں جس کی مثال یہ ہے کہ وہ اپنی موٹر کاروں اور سائیکلوں کا مقررہ ٹیکس نہیں ادا کر رہے ہیں۔ ہزاروں سائیکلیں چلتی ہیں لیکن ٹیکس صرف ساٹھ سینٹ (تقریباً پانچ روپئے) سالانہ آتا ہے۔ بلجین حکومت محسوس کرتی ہے کہ ٹیکس نہ ادا کرنے والوں کی سائیکلیں ضبط کرنا اور زبردستی ٹیکس وصول کرنا کہیں زیادہ مہنگا پڑے گا۔ ان سائیکلوں کا چلتا رہنا بھی ضروری ہے کیونکہ ان پر سوار ہو کر لوگ کام پر جاتے ہیں .... افریقیوں نے کہہ دیا ہے کہ " ہم ٹیکس اس وقت تک نہیں دیں گے جب تک ہماری اپنی حکومت نہ قائم ہو جائے "

گذشتہ دس سال کے آغاز میں ایران کے اندر لگ بھگ ایک ہزار طالب علموں نے اور دوسرے شہریوں نے اس وقت کی حکومت کے خلاف عدم تشدد والی تحریک چلائی ان کا کہنا تھا کہ قومی انتخاب میں ناانصافی ہوئی ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں خاموش جلوس نکالے۔ جب پولیس نے انھیں روکا تو وہ بیچ سڑک پر بیٹھ گئے۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ صحیح کہتے تھے چنانچہ حکومت نے اصلاح کی۔

۱۹۶۱ء کے شروع میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں ایٹمی اسلحہ ترک کیے جانے

کے حق میں اور برطانیہ میں امریکہ کی جانب سے فوجی اڈے قایم کرنے کے خلاف عدم تشدد والی سول نافرمانی کی زبردست تحریک چلی جس میں ہزاروں آدمیوں نے حصہ لیا۔ لندن میں اس تحریک کی رہنمائی لارڈ برٹرینڈ رسل نے کی جو عالمی شہرت رکھنے والے فلسفی تھے اور جنہیں نوبل پرائز بھی ملا تھا۔ اسی طرح گلاسکو میں اس تحریک کی قیادت پروفیسر نکولس کیمپر نے کی انہوں نے دوسری جنگ کے موقعے پر کناڈا میں ایک برطانی ایٹمی توانائی منصوبے میں کام کیا تھا۔

ایک دوسرے نوبل امن پرائز حاصل کرنے والے بلجیم کے ریورنڈ ڈامنک پیرنے لیگ شہر میں 'مہاتما گاندھی بین الاقوامی نوجوان مرکز' قائم کیا ہے۔ اس کا مقصد ہے دنیا کے نوجوانوں میں آپسی میل جول کا رجحان پیدا کرنا تاکہ نسل اور مذہب سے بلند ہو کر نوجوانوں میں رواداری پیدا ہو سکے۔

مغربی نصف الارمن میں دور ارجنٹا 'نا میں بھی گاندھی جی کی تعلیمات کی روشنی پائی جاتی ہے وہاں کے کارڈوبا صوبے میں ایک نیا اسکول گاندھی جی کی یاد میں کھولا گیا۔ کارڈوبا میں گاندھی جی کے بہت سے ماننے والوں میں اور ہندوستان کے عقیدت مندوں کو اس قسم کا اسکول کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے اس کے لیے چندہ جمع کیا لیکن جب ضرورت بھر کی رقم اکٹھا نہ ہو سکی تو حکومت نے بھی مدد کی۔

گاندھی جی کی ہی مثال سے متاثر ہو کر فونکس نامی ناؤ کے مسافروں کی یہ کوشش رہی کہ وہ ہمدردی اور خیرسگالی کے اظہار کے شمالی ویٹ نام کے اسپتالوں میں دوائیں وغیرہ پہنچا دیا کریں۔ ان کی یہ کوشش کبھی کامیاب رہی کبھی ناکام۔

عدم تشدد کارروائی کمیٹی نام کی ایک جماعت کے زیراہتمام کئی درجن امن پسند امریکیوں نے ۱۹۶۱ء میں ماسکو کے 'ریڈ اسکوائر' کے لیے ایک امن سفر کا بندوبست کیا لیکن وہاں کے بڑے ذمہ داروں نے ان پر یہ پابندی لگا دی کہ آپ لوگ کہیں تقریر نہ کریں گے نہ ریڈ اسکوائر پر اور نہ کہیں اور۔ لیکن یہ لوگ اس پابندی کو توڑتے ہوئے ماسکو یونیورسٹی گئے اور وہاں کے طالب علموں کے سامنے تقریر کرنے کی کوشش کی اور ذمہ داروں کی جانب سے اعتراض کے باوجود وہ اس میں کامیاب رہے۔ انھوں نے جس طرح امریکہ کے لوگوں سے کہا تھا اسی طرح روس کے رہنے والوں سے اپیل کی کہ ایٹمی

ہتھیار ترک کر دیے جائیں۔

گاندھی جی اگر زندہ ہوتے تو وہ ان سب کارروائیوں سے خوش ہوتے کیونکہ ان سب کے ذریعے اسی اصول کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی جو انہوں نے سکھایا تھا، ہمدردی اور محبت کی طاقت سے تشدد پر قابو پانے کے متعلق، مارٹن لوتھر کنگ (جونیئر) کے قتل کے بعد ایک کارٹونسٹ نے ایک بڑا اچھا کارٹون بنایا تھا۔ اس کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ گاندھی جی بیٹھے ہیں ڈاکٹر مارٹن لوتھر کھڑے ہیں اور گاندھی جی ان سے کہہ رہے ہیں "ڈاکٹر لوتھر! عجیب بات یہ ہے کہ تمھارے قاتل یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تمہیں ختم کر دیا۔"

کنگ مارٹن لوتھر ۱۹۵۸ میں راج گھاٹ پر نذر عقیدت پیش کرتے ہوئے